ٹیگور اور اُنکی شاعری

مخدوم محی الدین

بی۔ اے (عثمانیہ)

مطبع عہد آفریں حیدرآباد دکن

سلسلۂ ادبیات اردو
شمارہ ۲

مدیر عمومی ڈاکٹر سید محی الدین قادری پروفیسر زبان اردو جامعہ عثمانیہ

ٹیگور اور انکی شاعری

از

مخدوم محی الدین

بی۔ اے عثمانیہ سابق مدیر مجلۂ عثمانیہ معتمد بزم اردو جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد دکن
۱۹۳۵ء

مطبوعہ عہد آفریں پریس

باراول
قیمت ۸؍

سلسلۂ ادبیات اُردو

کی

دوسری مطبوعہ زیر طبع یا زیر تصنیف کتابیں

۱۔ ورڈسورتھ اور اسکی شاعری — از میر حسن صاحب۔ بی۔ اے۔ ... عثمانیہ

۲۔ یوسف ہند قید فرنگ میں — یعنی واقعات قید غالب۔ از محسن بن شبیر صاحب بی اے ،،

۳۔ ہوش کے ناخن — از میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان ... ،،

۴۔ خواجہ میر درد .. انکی حیات اور شاعری۔ — از غلام محمد خاں صاحب بی۔ اے ... ،،

۵۔ ولی اورنگ آبادی .. حیات اور شاعری۔ — از میر عابد علی خاں صاحب بی۔ اے .. ،،

۶۔ فن سوانح نگاری۔ جس کے آخر میں اردو سوانح عمریوں پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

از میر حسن صاحب۔ بی۔ اے ... ،،

۷۔ انگریزی ادب کی مختصر تاریخ — از میر حسن صاحب۔ بی۔ اے ... ،، / از میرزا ہد علی کامل صاحب۔ بی۔ اے .. ،،

۸۔ قصائد نصرتی۔ جسکے ساتھ بیجاپور کے اردو ملک الشعرا نصرتی کی حیات اور شاعری پر مکمل مقدمہ رہیگا۔

از سید علی صاحب۔ بی۔ اے ... ،،

۹۔ دکن میں مرثیہ گوئی .. آغاز سے عہد حاضر تک۔ — از سعادت علی رضوی صاحب۔ بی۔ اے .. ،،

۱۰۔ فیض حیدر آبادی — از مرزا سرفراز علی صاحب۔

۱۱۔ ماہ لقا بائی چندا اور اسکی شاعری — از سید اختر حسن صاحب۔

۱۲۔ ارشیر محمد خاں ایمان — از سید اشفاق حسین صاحب

دیباچہ عمومی

اردو میں ایسی کتابوں کی سخت ضرورت ہے جنمیں ادبیات سے متعلق عام معلومات حاصل ہوسکتی ہوں، جنکا مطالعہ شعر و شاعری اور تنقید و ادب عالیہ کا صحیح ذوق بڑھانے میں مدد دیسکے، اور جو اردو انشا پردازی اور تصنیف و تالیف سے دلچسپی رکھنے والوں کیلیے علمی و تاریخی حوالوں، اور ادب و تنقید کی نسبت معیاری و مستند نظریوں یا خیالات کا سرچشمہ ثابت ہوں، جب تک اس قسم کا ادب ہماری زبان میں موجود نہ ہوگا نہ تو ہماری نظریں وسیع ہونگی نہ ہمارے خیالات میں گہرائی پیدا ہوسکے گی اور نہ ہمارا ادبی ذوق صحت و رفعت حاصل کرسکے گا۔ یہی وہ خصوصیتیں ہیں جیکے بغیر اعلیٰ درجہ کی اچھی انشا پردازی ممکن نہیں، اور جنکی کمی کی وجہ سے ہماری زبان میں بڑے بڑے لکھنے والے کم پیدا ہو رہے ہیں۔

اس چھوٹی سی کتاب کا مطالعہ آپ پر واضح کر دے گا کہ "سلسلۂ ادبیات اردو" اسی افسوسناک کمی کو پورا کرنیکی خاطر قایم کیا گیا ہے، اور اس سلسلہ کی زیر طبع یا زیر تصنیف کتابوں کی منسلکہ فہرست سے آپ معلوم کریں گے کہ اس میں وہی کتابیں شایع ہوتی رہیں گی جو ایک طرف تو ہمارے ادبی کام کرنے والوں کی دستگیری کریں گی اور نئی پود یا مغربی زبانوں سے ناواقف اصحاب کے لئے معلومات و خیالات کا بیش بہا ارد و ذخیرہ ثابت ہونگی، اور دوسری طرف خود اردو میں ترقی و اضافہ کا باعث ہوں گی اور کیا

عجب ہے اگر اس سلسلہ کی کتابیں بجائے خود ادب پارے ثابت ہوں۔

اس سلسلہ کی اشاعت وطباعت ممنون منت ہے بعض احباب کے مالی ایثار کی جنہوں نے ازراہ علم دوستی اس کے لئے ایک ایک سو روپیہ کا عطیہ عنایت کیا، اور اس سلسلہ کی بنیاد ڈالی جو ممکن ہے آج حقیر نظر آئے لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ تمام بڑے کام ابتدا میں بڑے نہیں ہوتے اور نہ نظر آتے ہیں۔ اس کے بانیوں کا اصل مقصد یہی ہے کہ اردو ادب کی صحیح خدمت ہو سکے اور متذکرہ ضرورتوں کے مطابق ہمارے جن صاحب ذوق دوستوں اور طالبعلموں نے ہماری تحریک پر اس سال ڈیڑھ سال کے عرصہ میں متفرق موضوعوں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں خاص محنت وجانفشانی سے تحریر کیں ہیں ان کی اشاعت کی سبیل نکل آئے۔

نامناسب ہو گا اگر اردو ادب پر علمی اور سنجیدہ غور وخوص کرنیوالے شعر وشاعری کے نقاد، اور قابل قدر ادیب مولوی عبدالقادر صاحب سروری۔ ام۔ اے۔ ال ال بی مددگار پروفیسر اردو کی اس امداد واعانت کا تذکرہ نہ کروں جو اس سلسلہ کے قیام میں تقویت کا باعث ہوئی۔ ساتھ ہی ہمارے علم دوست اور صاحب احساس احباب مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی۔ ام۔ اے۔ ال ال بی مددگار پروفیسر تاریخ، مولوی عبدالقادر صاحب صدیقی۔ ام۔ اے مددگار پروفیسر کلام اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل مددگار دفتر دیوانی حیدرآباد کے نام شاید ہی بھلائے جاسکیں جنہوں نے اپنے رقمی عطیوں سے اس سلسلہ میں جان ڈالدی۔

سید محی الدین قادری

انتساب

میں اس حقیر ادبی کوشش کو بصد ادب و خلوص اردو کے محسن استادی

مولوی عبدالحق صاحب مدظلہٗ

پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کے نام سے معنون کرنیکی عزت حاصل کرتا ہوں

مخدوم محی الدین

موجودہ میکانکی دور میں جبکہ انسانیت کے اعلیٰ تصورات کو بُری طرح کچل دیا گیا ہے، جبکہ انسان افادیت کا غلام بنکر رہ گیا ہے۔ جبکہ مشینوں کی گھڑگھڑاہٹ اور توپوں کی گرج میں ہر صدا صدا بہ صحرا کا مرتبہ رکھتی ہے، کیا کوئی اس کا خیال بھی ذہن میں لا سکتا تھا کہ برسوں سے غلامی کی بندشوں میں جکڑے ہوئے ملک سے ایک ایسی صدا بھی بلند ہوگی جو توپ اور مشین کے گوش ناشنوا کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلے گی؟ . . . . . . بنگال سے ایک شخص نکلتا ہے جس کے چہرے پر پیغمبرانہ جلال اور جس کے کلام میں مسیحا کا سا اعجاز ہے، جس کو دیکھتے ہی فرطِ احترام سے بے ساختہ دنیا کی گردنیں جھک جاتی ہیں اور جس کے کلام کو سُن کر مُردہ اور بے روح مشینوں میں بھی جان

آجاتی ہے، اُن کے آہنی دلوں میں بھی عجز و عبودیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ بھی اسی کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں۔ اس کتاب میں اسی فوق الانسان کی حقیقی زندگی، اس کے اصلی کردار، اور اس کے کلام و پیام کو واقعی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور کی تحریرات نے دنیا کی اکثر زبانوں پر اثر ڈالا ہے۔ ہر جگہ ان کے پرستار اور قدر دان موجود ہیں، لوگ ان کے کلام کو بڑے شوق سے پڑھتے اور سر آنکھوں پر رکھتے ہیں؛ پھر اُردو جو بنگالی کی ہمسایہ زبان ہے کیسے اس اثر سے بچ سکتی تھی، چنانچہ اردو پر بھی ٹیگور کا اثر ہوا۔ نیاز فتحپوری اُردو کے پہلے انشا پردازیں جنہوں نے اپنے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ گیتان جلی کا اُردو ترجمہ کرکے ٹیگور کو اُردو سے متعارف کرایا۔ گیتان جلی کا ترجمہ ہونا ہی تھا کہ ان کا دوسرا کلام بھی سُرعت کیساتھ اُردو میں منتقل ہوتا گیا۔ نظموں، افسانوں اور ڈراموں کے ترجمے اُردو رسالوں میں شایع ہوتے گئے، اب بھی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ کوئی رسالہ ان کے ذکر سے خالی نہیں رہتا۔ اس بے پناہ حملہ کا نتیجہ تھا کہ اُردو میں ایسے نوجوان انشا پردازوں اور شاعروں کا گروہ پیدا ہوا جس نے ٹیگور کے رنگ میں لکھنا شروع کیا اس جدید طرز نگارش کیوجہ سے اُردو نثر میں غیر مادی فضا کا عنصر غالب ہوتا گیا، روحانیت کی آڑ میں عبارت کو آراستہ کرنے کے لئے خوشنما الفاظ سے ایسا بانکپن پیدا کرنے کی کوشش کی گئی جو معنوی اعتبار سے بالکل مہمل تھا۔ جس کی خاطر اصلی معنی اور

مطلب کو بھی قربان کر دیا گیا۔ یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ کوئی بھی ٹیگور کے اصلی رنگ کو اپنا نہ سکا۔ بجائے اس کے اردو ادب میں نغموں کی ضیا باریاں، سنہری کرنوں کا تعطر، سازِ ہستی کا طلائی تبسم، نقرئی قہقہہ، نغمہ بردوش، ترنم در آغوش" جیسے سیکڑوں ہی فقرے وضع ہوئے جن کے نہ کوئی معنی ہیں نہ مطلب، جس کی وجہ سے زبان کو نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے، کیونکہ باوجود صحیح المذاق نقادوں کی رہنمائی کے اب بھی اس طرز کے لکھنے والے موجود ہیں۔

اس بے راہ روی کا ایک سبب تو عدم صلاحیت اور ٹیگور کا نہیں سمجھنا ہے، دوسرے خیالات سے استفادہ کی بجائے اسلوب کو چرانے کی کوشش کی گئی جس کا لازمی نتیجہ ناکامی تھا۔

گر ٹیگور کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو دو خصوصیتیں ایسی ملتی ہیں جن سے ان کا کلام مملو ہے۔ معنوی اعتبار سے روحانیت اور صوری اعتبار سے انداز بیان۔ روحانیت سے وہ کیفیات اور احساسات مراد ہیں جسے صرف دل محسوس کر سکتا ہے۔ جس کا تعلق ظاہر سے زیادہ باطن سے ہے ظاہر ہے کہ ان واردات کے اظہار کے لئے انداز بیان کا موہوم ہونا ہی حسن میں داخل ہے، یہی موہومیت ٹیگور کے کلام کی خصوصیت ہے۔ اگر ہم اردو میں ایسے شاعر کو ڈھونڈیں جس میں ٹیگور کی سی روحانیت اور اس کا سا موہوم پن پایا جاتا ہو تو ہمیں صرف ایک شاعر ملتا ہے اور وہ امجد حیدر آبادی ہے امجد اور ٹیگور کے کلام کو ساتھ ساتھ رکھ کر

پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی روح دو مختلف زبانوں میں ہم سے کلام کر رہی ہے۔ امجد نے اور شعرائے اردو کی طرح ٹیگور سے متاثر ہو کر یہ رنگ اختیار نہیں کیا۔ بلکہ یہ خود ان کا اپنا رنگ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں کیفیت اور اثر ہے، امجد اور اردو کے دوسرے شعراء میں جن پر ٹیگور کے اثر کا اطلاق ہوتا ہے فرق یہ ہے کہ دوسرے شعراء کا مبدء فیض ٹیگور کے اصلی کلام کے انگریزی یا اردو ترجمے ہیں۔ برخلاف اس کے امجد کا مصدر فیض وہی ہے جس سے خود ٹیگور استفادہ کرتے ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف اشارہ کافی ہے۔ البتہ دوسری کتاب آمجد اور ٹیگور میں اس موضوع پر بحث کی جائیگی۔

اردو کے دوسرے نامور شعراء میں جوش، افسر اور اختر ہی ایسے ہیں جن کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں ٹیگور کا اثر نمایاں ہے، افسر تو خاص طور پر ٹیگور سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ ان کا ایک شعر ہے:-

ایک ہو دیوان حافظ دوسرا گیتان جلی
ہوں یہ دو چیزیں تو پھر انسان دولتمند ہے

آفسر کے مجموعہ کلام میں بعض نظمیں تو بالکل ٹیگور کی نظموں کا ترجمہ ہیں، افسر نے نہ صرف ٹیگور کے خیالات سے استفادہ کیا ہے بلکہ اردو نظموں کے لئے بعض وقت بحریں بھی بنگالی منتخب کی ہیں جس کے لئے

"مالن" مثلاً پیش کی جا سکتی ہے۔

دوسرے انشا پرداز جنھوں نے ٹیگور کو مقبول بنانے اور اُن کے خیالات کو اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی اُن میں مرحوم عبدالرحمٰن بجنوری قابل ذکر ہیں۔ مرحوم گیتان جلی کا نظم معریٰ میں ترجمہ کرنا چاہتے تھے چنانچہ بعض نظموں کا ترجمہ کیا بھی مگر وہ پوری نظموں کا ترجمہ نہ کر سکے جس کی وجہ وہ خود یوں بیان کرتے ہیں:۔

"چونکہ ٹیگور کے کلام کو ترجمہ میں ادا کرنے کی عظمت کے لحاظ سے ایسی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی تھی جس کا میں متحمل نہ ہو سکا اس لئے یہ ارادہ پورا نہ ہوا"

مرحوم کے چند ترجمے یہاں پیش کئے جاتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ انھیں اپنے مقصد میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔

گیتان جلی کا پہلا شعر:۔

خوشی تیری اسی میں ہے بنا اک جام گل مجھکو
بھرے خالی کرے ہر دم زلالِ زندگانی سے
پھر اس نے کو تو لے کر ہر اک کہسار و وادی میں
اسی میں کی ہے دم تو نے ہمیشہ تازہ موسیقی

یا مثلاً گیتان جلی نظم ۹۰۔

موت و سنگ دے کی جس دم تیرے دروازہ پہ آ
کیا تو اضع اپنے مہماں کی بجا لائے گا تو

مرحبا سلکان ہمن حاضر ہے مینائے حیات
نوش عیش اور نیش غم دونوں کا یہ آمیزہ ہے
عمر کا میری ہے حاصل بس یہی لبریز جام
نوش جاں حاضر جو ہے بہر کرم فرمائیے

سرود تیرا کرے ہے روشن تمام عالم کو اے مغنی
ہے روح نغمہ رواں فلک پر مثال تار حیات دائم
رواں ہے گو سنگ ہوں مزاحم ترے ترانے کا پاک دریا
ہے کیسی دھن میں مرے تمنا شریک تیرے سرود میں ہے

جب تو دیتا حکم ہے مجھکو کہ ہوں نغمہ سرا
فخر سے دل میرا سینہ میں سما سکتا نہیں

اب میں اصل کتاب کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ٹیگور کی عالم گیر اہمیت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو اُن سے جو تعلق اردو کو پیدا ہو گیا ہے اُس کا اقتضا یہ تھا کہ اردو میں ایک ایسی کتاب لکھی جاتی جس میں شاعر کی زندگی اور اُس کے کارناموں پر علمی بحث کی جاتی اور اُس کے حقیقی پیام کو سمجھایا جاتا۔ اب تک اردو میں ٹیگور پر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کی حیثیت، تعارفی مختصر مضامین سے زیادہ نہیں۔ ان مضامین کا

دائرہ بحث محدود تھا، کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی جس کی وجہ سے شاعر کی ذہنی کے
جملہ پہلوؤں پر روشنی پڑتی۔ اسی کمی کے احساس نے مجھے اس کتاب کے
لکھنے پر آمادہ کیا۔ کوئی دو سال پہلے میں نے اس کتاب کے لکھنے کا ارادہ
کیا تھا، اگر امتحان اور کلیہ کی مشغولتیں نہ ہوتیں تو کبھی کے یہ کتاب منظر عام پر
آگئی ہوتی۔

ٹیگور کو سمجھنے کے جتنے بھی ممکنہ ذرائع تھے میں نے اُن سے استفادہ
کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے سب سے بڑا ذخیرہ جس سے مجھے مدد ملی وہ خود
رابندرا ناتھ ٹیگور کی تصانیف ہیں، یا وہ کتابیں ہیں جو اور لوگوں نے ان کے
متعلق لکھی ہیں۔ اُن تمام کتابوں کی فہرست علیحدہ دی گئی ہے جن سے
اس کتاب کی تدوین میں مدد لی گئی۔

ٹیگور پر لکھنے والے کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ بنگالی سے واقف
ہوتا، افسوس کہ مجھے بنگالی نہیں آتی، اگر میں بنگالی سیکھ کر کتاب لکھنے کے
انتظار میں رہتا تو نہ معلوم میری یہ آرزو کب پوری ہوتی۔ کچھ نہ ہونے سے
کچھ تو ہونا بہتر ہے۔ اسی لئے میں نے انگریزی اور اُردو ماخذوں
ہی کو غنیمت سمجھا۔

کتاب کی ترتیب تاریخ وار ہے، زندگی کے واقعات جیسے جیسے
رونما ہوتے گئے اُسی سلسلے سے ان کو درج کیا گیا ہے تاکہ شاعر کے
ذہنی تغیرات اور اُس کی شخصیت کی تکمیل کے ارتقائی منازل اچھی طرح
ذہن نشین ہو جائیں۔

یہ کتاب شائد وجود میں نہ آتی اگر میرے استاد ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے الطاف و عنایات میرے شامل حال نہ ہوتے، جب کبھی میرے عزم و استقلال میں تزلزل پیدا ہوا تو آپ ہی نے میری ہمت بندھائی اور مجھے کام کرنے کی طرف رجوع کیا جس کے لئے میں صاحب موصوف کا ممنون ہوں ۔

مخدوم محی الدین

جامعہ عثمانیہ - اپریل ۱۹۳۵ء

فہرست مضامین

پہلا دور
۱۸۶۱ء سے ۱۸۸۴ء تک

اُن تحریکات کا ذکر جسکی وجہ سے بنگال میں ادبیات عالیہ کا احیا رہوا۔ مغربی تعلیم، راجہ رام موہن رائے اور خود ٹیگور کے خاندان والوں کی خدمات، اور قابلیتوں کا ذکر۔

ٹیگور کس ماحول میں پیدا ہوئے۔ خارجی اور گھریلو ماحول ٹیگور کا بچپن۔ ماں کا انتقال۔ والد کی تربیت، کن اثرات نے ان کی شخصیت پر اثر ڈالا۔ تعلیم، مدرسوں سے بے زاری، فطرت سے عشق، شاعری کی ابتداء، ٹیگور کے بچپن کے رفیق اور اُن کا اثر ٹیگور کی زندگی پر۔ دور اول کی شاعری پر تبصرہ۔

دوسرا دور
۱۸۸۴ء سے ۱۹۰۱ء تک

شادی اور دوسرے دور کی ابتدار۔ زندگی میں زبردست تبدیلی، ذمہ داریاں، کاروار کا قیام، سنیاسی ڈرامہ، اُس پر تنقید، شیلدا کا قیام، کاشتکاروں سے میل جول، زرعی معاملات اور کاشتکاروں سے ہمدردی۔ اس دور کے افسانے اور اُن پر زرعی

ماحول کا اثر۔ ڈرامے، ان پر تنقید، سیاسی اور ادبی سرگرمیاں، مذہبی شاعری کا آغاز۔

تیسرا دور

۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک

ناول نویسی کی ابتدا، خصوصیات۔ علیحدگی بنگال کے جھگڑے میں ان کی خدمات۔ ڈاک گھر

ڈرامہ اس پر تنقید۔

چوتھا دور

۱۹۰۷ء سے ۱۹۲۴ء تک

عالم گیر شہرت، گیتان جلی، نوبل انعام، حلقہ بہار ڈرامہ اس پر تنقید۔
ٹیگور کی شاعری کے دوسرے رُخ۔ شباب کی شاعری پر تبصرہ، گیتان جلی اور گارڈنر کا فرق۔
کرسنٹ مون کا مرتبہ۔ مشرق بعید کا سفر، جنگ عظیم کا آغاز، قومیت کے خلاف جہاد۔

پانچواں دور

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۵ء تک

ٹیگور کا پیام، ہندستان اور یورپ کے نام۔ قومیت کے خلاف خطبات۔ عالمگیر برادری اور اخوت کی تعلیم، جنگ عظیم اور یورپ، مغرب کا مستقبل، ہندستان اور تحریک عدم تعاون، اس تحریک کی مخالفت، گاندھی اور ٹیگور کا مقابلہ۔
شاعر کا تعمیری کارنامہ، شانتی نکتان۔ اور اس کے حسن کارانہ اور معاشری پہلو۔ خاتمہ۔

ضمیمے

رابندرا ناتھ ٹیگور کی تصانیف

نظم

۱۔ گیتان جلی ۲۔ گارڈنر ۳۔ کرسنٹ مون ۴۔ لورس گفٹ اینڈ کراسنگ
۵۔ فرٹ گیادرنگ ۶۔ فجی ٹیو ۷۔ گولڈن بوٹ

ڈرامہ

۸۔ چترا ۹۔ ڈاک گھر ۱۰۔ اسیکل آف اسپرنگ (حلقہ بہار) ۱۱۔ دی کنگ آف ڈارک چیمبر
۱۲۔ قربانی ۱۳۔ مالنی ۱۴۔ سنیاسی ۱۵۔ مایا کھیلا
۱۶۔ خطرناک شکار (دی فیٹ فل ہنٹ) ۱۷۔ والمیکی کا جوہر ۱۸۔ رڈ آولینڈر (محبت کے پھول)

مقولات

۱۹۔ اسٹرے برڈس (طائر پریشاں) ۲۰۔ فائر فلائز (جگنو)

ناول اور افسانے

۲۱۔ گورا ۲۲۔ ہوم اینڈ دی ورلڈ (گھر اور دنیا) ۲۳۔ دی رک (تباہی)

۲۴۔ ہنگری اسٹونس (مجموعہ) ۲۵۔ ماشی اور دوسرے افسانے
۲۶۔ بروکن ٹائز۔

فلسفہ

۲۷۔ سدھنا ۲۸۔ تھاٹ ریلک ۲۹۔ پرسنالٹی ۳۰۔ کریٹیویونٹی
۳۱۔ نیشنلزم ۳۲۔ مذہب انسان۔

متفرق

۳۳۔ خود نوشتہ سوانحعمری ۳۴۔ بنگال کی جھلک ۳۵۔ روح جاپان

کتابیات

حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی

۱۔ رابندرا ناتھ ٹیگور کی تمام مطبوعات جن کی فہرست علیحدہ دی گئی ہے۔

۲۔ آٹو بیوگرافیکل اسٹڈی آف ٹیگور۔ ارنسٹ رائز

۳۔ حیات ٹیگور۔ اڈورڈ ٹامسن

۴۔ ٹیگور کا فلسفہ۔ پروفیسر رادھا کرشنا

۵۔ ایک دوست کے نام خطوط۔ سی۔ ایف اینڈریوز

۶۔ خطوط۔ رومن رولینڈ

۷۔ ٹیگور کی کتاب سالگرہ سی۔ ایف اینڈریوز

۸۔ خیالات گاندھی۔ ” ”

۹۔ مہارشی رابندرا ناتھ کی خود نوشتہ سوانحعمری۔

۱۰۔ مقدمہ گیتان جلی (انگریزی)۔ ییٹس

۱۱۔ مقدمہ گیتان جلی (اردو)۔ نیاز فتحپوری

۱۲۔ ٹیگور کا تصوف۔

۱۳۔ براؤننگ اور ٹیگور۔ جامعہ کلکتہ کا توسیعی لکچر

۱۴۔ رسالہ ایشیا، ماڈرن ریویو، رسالہ اردو، ہندستانی، نگار، زمانہ

۱۵۔ انسائکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس (اخلاقیات و مذہب کا انسائکلوپیڈیا)

ٹیگور کی وہ کتابیں جن کا اردو میں ترجمہ ہو چکا ہے

۱۔ گیتان جلی ۔ (نذر نغمہ)	نیاز فتحپوری	
۲۔ گارڈنر ۔ (باغبان)	سالک	
۳۔ چترا ۔ (ڈرامہ)	"	
۴۔ کرسنٹ مون ۔ (نظمیں)	"	
۵۔ رڈ آو لنڈر ۔ (محبت کے پھول)	فرید مچھلی شہری	
۶۔ سنیاسی ۔ (ڈرامہ)	محمد یحییٰ صدیقی ۔ بی ۔ اے (عثمانیہ)	

اردو رسالوں میں ٹیگور کی نظموں کے آئے دن ترجمے شائع ہوتے ہی رہتے ہیں۔ فسانوں میں ان کے ہر معروف و غیر معروف فسانہ کا اردو میں ایک سے زیادہ مرتبہ مختلف حضرات نے ترجمہ کیا ہے اور اب تک ان کا سلسلہ جاری ہے۔

ٹیگور اور اُن کی شاعری
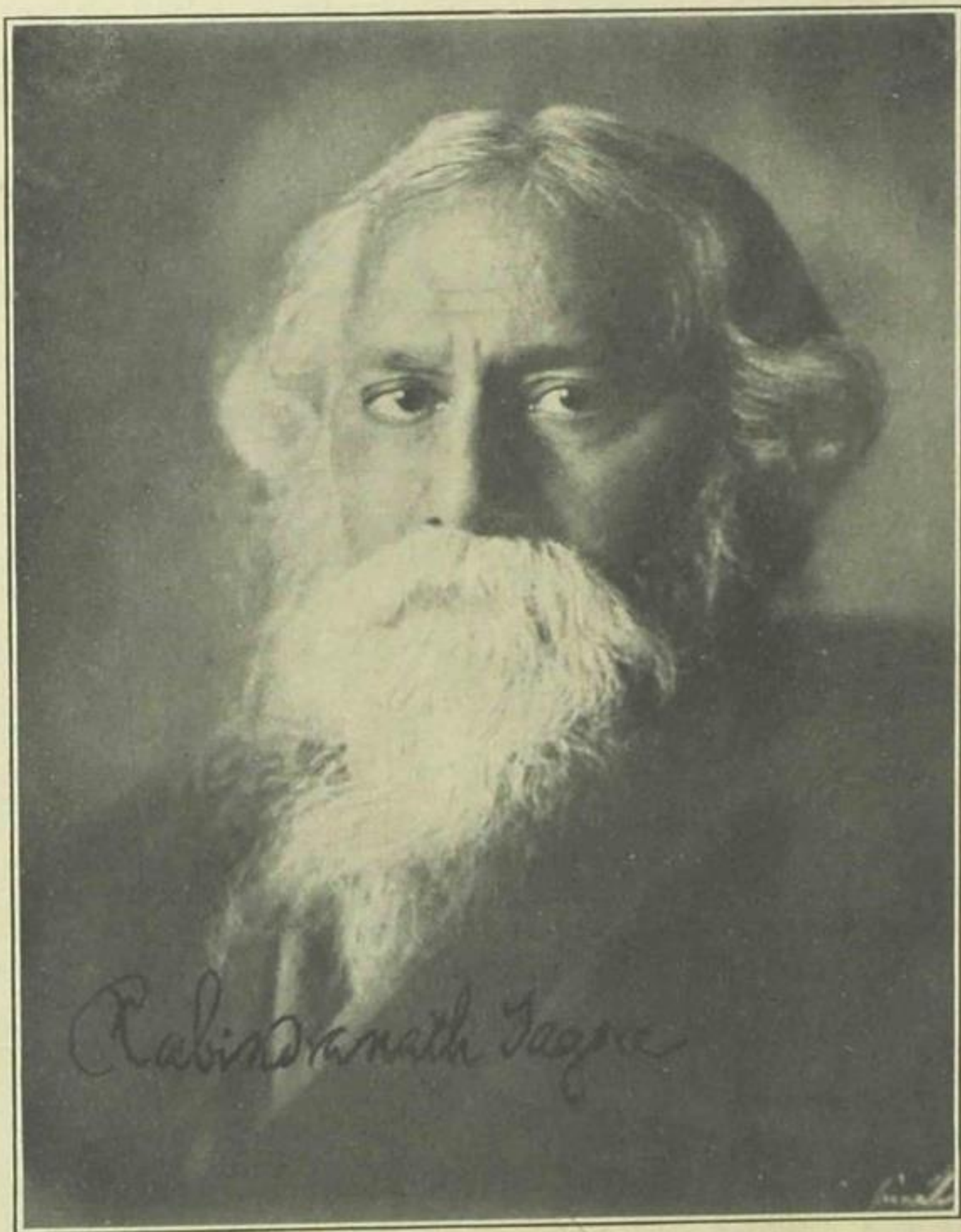
ڈاکٹر ربندرا ناتھ ٹیگور

(ہم مشکور ہیں کہ شاعر نے اپنی تازہ ترین
شبیہ مرحمت فرمائی)

بنگال کا نشاۃ ثانیہ

مغربی تہذیب نے خوابیدہ مشرق میں ایک نئی روح پھونک دی زندگی کے ہر شعبہ میں آثار زندگی پیدا ہو گئے۔ بنگال میں سنسکرت ادب کے احیاء کے بعد ہی مذاہب کی تنقیح اور تنقید شروع ہوئی۔ انھیں دو قوتوں یعنی احیاء ادب، اور اصلاح مذاہب نے بنگال کے نشاۃ ثانیہ کو تمام مشرق میں، ایک زندہ اور طاقتور وجود بنا دیا۔ خود بنگال میں ادب اور حسن کارانہ تحریکات کا فروغ ہوا۔ جس کے سرگروہ رابندرا ناتھ ٹیگور رہے ہیں۔

(۲)

انیسویں صدی کے اوائل میں جب (۱۸۳۵ء میں) لارڈ میکالے نے انگریزی حکومت کی دفتری ضرورتوں کے مد نظر اپنی تعلیمی تجاویز پیش کیں تو ملک میں بڑی ہلچل مچ گئی اس مسئلہ پر گرم بحثیں ہوئیں کہ آیا انگریزی تعلیم کی اشاعت ہو یا نہ ہو۔ بالآخر میکالے کو فتح ہوئی اور انگریزی زبان اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بن گئی۔ گو اس کی تجویزوں میں بہت سی خامیاں تھیں۔ اس نے سنسکرت کے ادبیات عالیہ کو حقارت سے دیکھا اور بنگالی کو بیکار سمجھ کر تعلیم میں کوئی درجہ نہیں دیا مگر یہی زیادتیاں ملک کے حق میں مفید ثابت ہوئیں۔ ملک کو ایک بیرونی حملہ کی ضرورت تھی تاکہ وہ خود اپنے وجود کو محفوظ کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار سکے۔ اور یہ ضرورت انگریزی تعلیم کی اشاعت سے پوری ہو گئی۔

مگر اس جدید زندگی نے ابتداً ملک میں کچھ خوشگوار اثرات پیدا نہیں کئے۔ قدیم معتقدات مذہب اور رسم و رواج خاص طور پر متاثر ہوئے۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ غیر معمولی طور پر انتہا پسندی سے کام لے کر ہر قدیم چیز کا دشمن بن گیا۔ معاشرہ میں عجیب ہڑبونگ اور گڑبڑ مچ گئی۔ مغرب کی اندھادھند اور گوسفندانہ تقلید نے جماعتی تخیل میں بے ربطی اور انتشار پیدا کیا۔

(۳)

اس پریشانی کے زمانہ میں ایک شخصیت ایسی تھی جس نے بنگال کو تباہی سے بچا لیا اور وہ راجہ رام موہن رائے ہیں۔ یہ زمانہ کی رَو کو سمجھے ہوئے تھے، انھیں اس کا کامل یقین تھا کہ مغربی علوم و فنون کا سیلاب کسی کے روکنے سے رک نہیں سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ مغربی علوم کی اشاعت میں وہ میکالے کے ہم خیال تھے۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کو ایک بار پھر اپنے شاندار عہد ماضی کا سبق پڑھا دیں تاکہ وہ اپنی عظمت کو اچھی طرح سمجھ کر خود بخود اپنے ادب عالیہ کی عزت کرے۔ انھوں نے اپنی مادری زبان بنگالی کو انگریزی کے مقابل پس پشت نہیں ڈالا۔ بلکہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں استعمال کر کے اس میں استحکام پیدا کیا۔ سر سید کو اپنے مشن کی تبلیغ میں جو رکاوٹیں پیدا ہوئیں اور اُن پر غلبہ پانے کے لئے جن مصائب سے انھیں دوچار ہونا پڑا اسی قسم کی دقتوں سے راجہ رام موہن رائے کو بھی سابقہ پڑا۔

(۴)

بنگالی ادب کے احیاء میں ایک دوسری ممتاز شخصیت رابندرا ناتھ کے

والد کی ہے ان کا عمل اور اثر کافی عرصہ تک جاری رہا۔ اگر راجہ موہن رائے کو ادبی درخت کی جڑ فرض کیا جائے تو دوندر ناتھ اُس کی مضبوط شاخ تھے اور رابندر ناتھ ٹیگور اُس کا ثمر۔ دوندر ناتھ کی خود نوشتہ سوانح عمری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر مصلح اعظم راجہ رام موہن رائے کی تعلیمات اور شخصیت کا اثر ابتدائے عمر ہی سے بہت گہرا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ یہ بھی برہمو سماج مسلک کے جوشیلے مبلغ بن گئے۔

انیسویں صدی کے وسط کی انھیں ابتدائی تحریکات کی وجہ سے بنگالی ادب کی تاریخ میں تخلیقی ادب کی بنیاد پڑی۔ یہ بیداری نہ صرف بنگال بلکہ پورے مشرق کی ترقی کا پیش خیمہ تھی۔

(۵)

اس دور احیاء میں مغربی علوم اور سنسکرت ادب کے درمیان ایک تعلق پیدا ہوتا گیا۔ تارو دت نے جو اُس زمانہ کی حسین ترین انشاء پرداز عورت تھی انگریزی میں ایسی نظمیں لکھنی شروع کیں جس کی روح بالکل قدیم ہندوستانی ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا کلام قومی سرمایہ بن گیا۔ میکائل دت نے بھی انگریزی میں نظمیں لکھنی شروع کیں مگر یہ اضافہ کیا کہ بحریں بنگالی منتخب کیں اس کا اسلوب ایسا پُرشوکت تھا کہ اُسے بنگال کا ملٹن کہا جاتا ہے۔

بیانکم کے ناولوں میں بھی قدیم و جدید عصر کی امتزاجی کیفیت ہوا کرتی تھی۔ وہ بھی نئے اصولوں پر ہندوستان کی اصلی روح کو اپنے ناولوں میں پیش کیا کرتا تھا۔ غرض ان جدید تحریکات ادبی کا نتیجہ تھا کہ عوام کے جذبات کی ترجمانی ہونے لگی۔

اور رومانیت کا اثر بڑھتا چلا گیا۔ نفس مضمون اور زبان دونوں کے لحاظ سے بنگال کے ادب میں عام دلچسپی کا مسالہ شامل ہوتا گیا۔

اسی گراں مایہ ذخیرہ سے متاثر ہو کر رابندرا ناتھ نے اپنی نظموں اور گانوں سے ملک کو متاثر کیا۔ بیانکم ناول نویس کو جب ایک مجمع میں پھول کے ہار پہنائے گئے تو اُس نے اپنی گردن سے نکال کر نوجوان انشا پرداز رابندرا ناتھ کے گلہ میں ڈال دیا جو اُس کے قدموں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے اس بوڑھے ناول نویس کی یہ پیشین گوئی صحیح نکلی۔ ٹیگور نہ صرف بنگال کے بڑے حسن کار بلکہ دنیا کے مسلم ادیب بن گئے اور تمام دنیا نے انھیں عظمت کے ہار پہنائے۔
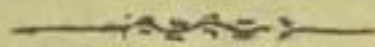
خاندان

دنیا میں بہت کم ایسے خاندان ہیں جو بیک وقت دولت دنیوی اور دولت علم دونوں سے سرفراز ہوں۔ بنگالی میں ایک کہاوت ہے کہ علم کی دیوی سرسوتی اور دولت کی دیوی لچھمی ایک ساتھ نہیں رہتے، مگر ٹیگور کا خاندان مستثنیات سے ہے۔ اس خاندان والے جہاں بڑی جائیدادوں اور زمینوں کے مالک ہیں ادب، مذہب، شاعری، مصوری اور موسیقی کے بھی علمبردار ہیں۔ تہذیب وتمدن کے پورے لوازمات اس خاندان کے وظیفہ حیات ہیں۔ رابندرا ناتھ ٹیگور نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ شاعری اور موسیقیت سے معمور تھی۔

رابندراناتھ کے دادا دوارکاناتھ ایک وسیع جائیداد کے مالک اور برہما سماج کے موسس راجہ رام موہن رائے کے دست راست تھے۔ راجہ رام موہن رائے کی طرح انھوں نے بھی انگلستان کا سفر کیا اور اپنی جاہ وثروت اور طرز زندگی کی بناء پر وہاں شہزادہ دوارکاناتھ کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ طبیعت مسلانہ پائی تھی۔ پیسہ پانی کیطرح بہاتے تھے، بیدریغ خرچ کیوجہ سے بڑا قرضہ چھوڑ کر مرے جسکو انکے بیٹے دوندراناتھ نے بعد میں ادا کیا۔

شاعر ٹیگور کے والد دوندراناتھ ٹیگور ادب، فنون لطیفہ، فلسفہ اور فطرت کے عاشق اور ساتھ ہی پکے صوفی اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں کے عامل انسان تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اسلامی ادبیات کی ہندوستان میں وہی قدر تھی جو آجکل مغربی علوم کی ہے چنانچہ دوندراناتھ فارسی کی اچھی قابلیت رکھتے تھے، مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ

انکی محبوب کتابیں تھیں۔ عرفان کی تلاش میں انھوں نے ایک بڑا عرصہ ہمالیہ کی چوٹیوں پر حافظ کی غزلوں کو گاتے ہوئے گذارا۔ پھر اپنی باقیماندہ زندگی برہما سماج کے پرچار اور استحکام میں صرف کی۔

راجہ رام موہن رائے نے اس مسلک کا سنگ بنیاد رکھا تھا تو ان بنیادوں پر عمارت کھڑی کرنیوالے دوندرا ناتھ ٹیگور تھے۔ پاک اور بے لوث زندگی اور روحانی تصرفات کی بنا پر انھیں "مہارشی" کہا جاتا ہے۔ یہی اثرات انکے بیٹے رابندرا ناتھ ٹیگور کو بھی ورثتاً ملے جنکی جھلک انکی شخصیت اور کلام میں موجود ہے۔

قدرت نے دل کھولکر اس خاندان پر نعمتوں کی بارش کی اسکا ہر فرد کسی نہ کسی خاص قابلیت کا مالک ہے۔ چنانچہ ٹیگور کے بڑے بھائی دوجندرا ناتھ بڑے فلسفی ہیں اور بیان کیا جاتا ہے کہ ایسی مقناطیسی قوت رکھتے ہیں کہ پرند انکے بازوؤں پر بے جھجک بیٹھتے ہیں ایک دوسرے بھائی جالونرندرا ناتھ آرٹسٹ ہیں جنھوں نے اپنے پنسل کے کام پر مغرب سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اُن کے ایک اور بھائی پہلے ہندوستانی ہیں جو انڈین سول سروس میں منتخب ہوئے۔ ابندرا ناتھ اور گنگا نندرا ناتھ انکے دو بھتیجے بنگالی آرٹ کے ممتاز ماہر ہیں۔ اول الذکر تو ایک آرٹ سکول کے صدر ہیں یہ ادارہ نہ صرف ہندستان بلکہ بیرون ملک کا بھی مرکز توجہ ہے۔ اُن کی تصاویر عالمگیر شہرت رکھتی ہیں۔

موسیقی میں بھی یہ خاندان خاص امتیاز رکھتا ہے خود رابندرا ناتھ اچھے ماہر موسیقی ہیں اور انکے اکثر رشتہ دار اس فن کے مسلمہ استاد ہیں۔ انکے بھائی جوتندرا ناتھ نے جو موسیقی میں خاص کمال رکھتے ہیں شاعر ٹیگور کی اکثر غزلوں کو راگوں میں تبدیل کیا۔

راجہ سورندرا موہن ٹیگور موسیقی کے ڈاکٹر ہیں۔ موسیقی پر ان کے کئی عالمانہ مقالے ہیں جو بنگالی موسیقی میں نئے باب کا اضافہ کرتے ہیں۔

غرض شعر و موسیقیت کی جملہ لطافتیں رابندرا ناتھ ٹیگور کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں اور یہ اپنے آغاز عمر ہی سے ہندستانی نشاۃ ثانیہ کی آغوش میں پرورش پا رہے تھے۔

پیدائش اور بچپن

رابندر ناتھ ٹیگور ۱۸۶۱ء کی ۶ مئی کو کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ ٹیگور خاندانی نام ہے جو ٹھاکر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس کے معنی سردار یا مالک کے ہیں۔ یہ بچپن میں لاڈ سے رابی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ ابھی کم سن ہی تھے کہ قدرت نے انھیں اپنی ماں کی گود سے ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا، اس دوامی جدائی کا ننھے سے دل پر سخت صدمہ تھا رہے والد وہ عموماً مکان سے باہر ہی رہا کرتے تھے کبھی کبھار مکان چلے آئے تو بچہ کو دیکھ لیا۔ بچہ کی دیکھ بھال ملازمین کے سپرد تھی۔ یہ بہت تنہائی اور پریشانی محسوس کرتے تھے، پھر بھی ایک ایسا سکون بخش وجود تھا جو ایسی بیکسی کے زمانہ میں ان کا دل بہلایا کرتا۔ چنانچہ اس زمانہ کی تصویر ٹیگور خود مسٹر ایف آنڈریوز کے خط میں یوں کھینچتے ہیں:-

"میں تنہا تھا۔ یہ میرے بچپن کا اہم واقعہ ہے۔ میں اپنے والد کو بہت کم دیکھ سکتا تھا۔ وہ اکثر باہر ہی رہتے تھے، والد کے انتقال کے بعد ملازموں کی نگرانی میں دیا گیا۔ روزانہ دریچہ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا اور تصور کرتا کہ اس سے باہر کی دنیا کیا ہوگی۔ مجھے یاد ہے کہ اس پہلے ہی دن سے مجھے فطرت سے بے انتہا انس تھا۔ آہ۔ میں خوشی سے دیوانہ ہو جاتا تھا جب دیکھتا کہ آسمان پر بادل ایک کے بعد ایک گذرتے جاتے ہیں۔ اُن بچپن کے ابتدائی دنوں میں میں محسوس کرتا تھا کہ میں ایک گھرے

اور جانی دوست کی رفاقت میں ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا اُنکو کس نام سے
پکاروں۔ مجھے فطرت سے اس شدت سے محبت تھی کہ میں تم سے بیان نہیں کر سکتا۔
مگر فطرت ایک غمگسار دوست کیطرح ہمیشہ ساتھ رہتی اور تازہ حسن کا انکشاف کیا کرتی تھی۔"

کلکتہ کا سہ منزلہ مکان جہاں ٹیگور کا بچپن گذرا تھا۔ کمروں بر آمدوں اور وسیع صحنوں
اور باغ پر مشتمل ہے۔ ان کے بچپن کا محبوب مشغلہ انھیں بر آمدوں سے باہر کی سیر کرنا تھا۔
وہ یہیں سے قریب کے تالاب کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ تالاب پر لوگوں کا آنا جانا نہانا
دھونا اپنے اندر خاص کشش رکھتا تھا۔ دوپہر تک یہ اس منظر میں کھوئے سے رہتے تھے،
جب تالاب کی دلچسپیاں ختم ہو جاتیں تو گھر کا باغ اُن کی تفریح گاہ بن جاتا۔ باغ کی معصوم
فضائیں اپنی آغوش میں لیکر بچہ کا دل بہلاتیں۔ وہ مولسری اور ناریل کے
درختوں کی چھاؤں میں کبھی اکیلے اور کبھی نوکروں کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے
۔ ۔ یہی ان کی جنت تھی۔

"موسم خزاں میں صبح سویرے" وہ لکھتے ہیں "بستر سے اُٹھتے ہی میں باغ کیطرف
بھاگتا تھا۔ شبنمی گھاس اور پھولوں کی خوشبو مجھے اپنی چھاتی سے لگانے کے لئے
میری طرف لپکتی تھی۔ صبح اپنی نوخیز سورج کی نازک اور تازہ شعاعوں کے ساتھ
ناریل کے مُرتعش پتوں سے میری طرف جھانکا کرتی تھی۔"

ایک اور جگہ انھیں درختوں سے مخاطب ہو کر جس کے سایہ میں یہ پل کر
جوان ہوئے تھے یوں لکھتے ہیں:۔

"اپنی پیچیدہ اور دراز پارنیوں کے ساتھ جو تمہاری شاخوں سے لٹک

رہے ہیں۔

اُو بڑ کے درختو۔

تم ایک جوگی کی طرح جو مراقبہ میں ہے دن رات کھڑے رہتے ہو۔ کیا تم اُس بچہ کو بھی جانتے ہو جس کا تخیل تمہارے سایہ سے کھیلا کرتا تھا۔"

بچپن میں ہمارے شاعر کے لئے یہی آسمانی کھلونے اسباب تفریح تھے، گھر سے باہر نکلنے کی انھیں اجازت کہاں وہ چیز جو "باہر" کہلاتی ہے ان کی دسترس سے باہر تھی۔ دل میں ایک تجسس اور خلش ضرور رہا کرتی تھی کہ باہر کی دنیا کیا ہوگی۔ مگر بھائیوں اور گھر کی عورتوں کی صحبت نوکروں اور ان کے بچوں کی چہل پہل تالاب کے نظارے باغ کی سیر یہ سب مشاغل اپنے اندر ایسی جاذبیت اور دلبستگی رکھتے تھے کہ ایک حدتک انھیں باہر کی دنیا کا بدل کہہ سکتے ہیں۔ اور سب سے بڑھکر اس زمانہ کی دوست ان کی بھاوج تھیں جو ابھی ابھی گھر میں نئی نویلی دلہن کی حیثیت سے آئی تھیں۔ انھیں اس نونہال سے خاص اُنس ہو گیا تھا۔ دن کا بیشتر حصہ یہ اپنی بھاوج ہی کے ساتھ گذارتے تھے۔ مگر گھر کی چار دیواری کا یہ بے زنجیر قیدی جب "چوڑی بنگڑی گوٹ" کی صدا سُنتا تو اُس کے طفلانہ دماغ پر باہر کی وسیع اور لامحدود دنیا کا تخیل معمہ بنکر رہ جاتا۔ ذیل کی نظم اس دور کی ترجمانی کرتی ہے:۔

"پالتو چڑیا پنجرہ میں تھی۔ اور آزاد چڑیا جنگل میں قسمت کی خوبی ایسی ہوئی کہ دونوں ملیں۔ آزاد چڑیا نے کہا "او میرے محبوب آ ہم دونوں جنگل میں اُڑیں۔"

پنجرے کی چڑیا نے کان میں کہا "یہاں آ ہم دونوں پنجرے میں رہیں"۔
آزاد چڑیا نے کہا "کہاں؟ . . ان قفس کی تیلیوں میں جہاں پر پھیلانے کی جگہ نہیں"۔
"افسوس" مقید چڑیا نے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ وسیع آسمانوں میں اُڑکر بیٹھنے کی جگہ کہاں ہے"۔

رابندرانا تھ قد میں چھوٹے تھے، اور گھر کی دیواریں بڑی تھیں۔ یہ جب ذرا بڑے ہوئے اور نوکروں کے پنجہ سے انھیں کسی قدر چھٹکارا ملا تو دوپہر کے وقت جبکہ تمام گھر والے دوپہر کا کھانا کھا کر آرام کرتے اور گھر کے کاروبار میں سکون پیدا ہوتا تو چپکے سے "یہ مقید پرند" دیوار پر سے باہر کے آزاد پرند سے خاموش گفتگو کیا کرتا۔

پہلے پہل باہر نکلنا

فطرت سے عشق

ایک مرتبہ کلکتہ میں سخت وبا پھیلی تو ٹیگور کا خاندان شہر سے دُور گنگا کے کنارے آکر ٹھیرا۔ ٹیگور بھی انھیں میں تھے۔ اور یہ ان کی عمر میں پہلا واقعہ تھا کہ باہر نکلے۔ یہاں فطرت اپنی گوناگوں رنگین دلچسپیوں کے ساتھ بچہ کو اپنی گود میں لینے کے لئے موجود تھی پتہ پتہ نے ان کا استقبال کیا۔

اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھتے ہیں "روزانہ صبح کو جب میں اُٹھتا تو ایسا محسوس کرتا کہ دن ایک سنہری خط کی طرح میرے پاس آتا ہے جو لفافہ کھولنے پر چند نئی اور اَن سنی باتوں کا انکشاف کریگا۔" جنگل کی ہوا، دریا کا کنارہ، طلوع وغروب آفتاب کے مناظر، دریا کا مدوجزر، درختوں کا سایہ اور شفق کی رنگینیوں نے ٹیگور کا دل ایسا لبھایا کہ یہاں ان کا واحد مشغلہ فطرت کی والہانہ پرستش ہی تھا۔ جب اُودے اُودے بادل فضا میں دوڑتے پھرتے تو یہ فرط مسرت سے اتنے بیخود ہو جاتے کہ ان کا پاؤں زمین پر نہ ٹکتا۔ ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی۔ اور رقص کرنا شروع کردیتے جو دل کے طوفانی جذبات کے

اظہار کا آخری اور غیر ارادی فعل ہے۔ ان کو فطرت سے عشق تھا اور اب بھی ہے۔ ان کی نظمیں اور قصے اس جذبۂ محبت کی غمازی کرتے ہیں۔ ان کے تمام ادبی کارنامے فطرت کے حسین وجمیل مُرقعوں سے پُر ہیں۔ ان کے کلام میں ہر جگہ فطرت ایک انوکھے انداز میں رونما ہوتی ہے۔ یوں تو یہ اپنے قلم سے ہر چیز کو رنگین بناتے ہیں مگر فطرت کی منظر کشی میں ایک خاص کیف اور مستانہ پن پایا جاتا ہے۔

تعلیم

دنیا کے مشاہیر کی زندگیوں میں یہ بات مشترک معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے جو کچھ حاصل کیا وہ مکتب اور اُستاد سے نہیں بلکہ ماحول سے تجربہ اُنکی کتاب اور زمانہ اُن کا اُستاد رہا ہے۔ وہ بجائے کتابوں اور کتب خانوں کے صحیفۂ فطرت اور معلم باطنی سے اکتساب فیض کرتے ہیں۔ ٹیگور کو بھی مدرسہ اور اُستاد سے کبھی دلچسپی نہیں رہی جس کی بڑی وجہ مدرسوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی ہونا اور اُستادوں کی حوصلہ شکن تنبیہ تھی۔ جس کی تلخ یاد ابھی تک شاعر کے دماغ میں محفوظ ہے۔ اور "شانتی نکتان" کے وجود میں آنے کا سبب بچپن کے یہی تعلیمی تجربے ہیں۔ اپنی تعلیم سے متعلق وہ خود یوں لکھتے ہیں:۔

"خوش قسمتی سے میری ایک ایسے گھر میں پرورش ہوئی جہاں موسیقی، ادب، آرٹ، غیر شعوری طور پر مجھ میں سرایت کرتے گئے۔ میرے بھائی اور رشتہ دار سب خیالات کی آزاد فضا میں رہتے تھے۔ اور ان میں سے اکثر حسن کارانہ قابلیتوں کے مالک تھے۔ اس ماحول میں پلتے ہوئے میں نے شروع ہی سے سوچنا، خواب دیکھنا، اور اپنے تخیلات کا اظہار کرنا شروع کیا۔ ہمارا خاندان مذہبی، اور معاشرتی معاملات میں روایتی معتقدات سے پاک تھا۔ اس کی وجہ سے ہمارے دماغ بے خوف اور آزاد ہو گئے تھے، اور ہم زندگی کے ہر شعبہ میں تجربے کیا کرتے تھے،

یہ تھی وہ تعلیم جو میں نے اپنے اوائل عمر میں حاصل کی۔ میں اپنے دماغی اور حسن کارانہ قابلیتوں کو استعمال کرنے میں آزاد اور خود مختار تھا کیونکہ میرا دماغ اس کی وجہ سے بالکل فطری طریقہ پر زندگی کے منازل طے کرتا ہوا نشو ونما پا رہا تھا۔ اس لئے مدرسہ کے بے جا قیود میرے لئے عذاب جان اور ناقابل برداشت ہو گئے تھے۔" (خطبات)

مدرسہ بچوں کا باہر جانیکا شوق تقاضائے عمر ہے، ایک دن ٹیگور نے دیکھا کہ ان کے بڑے بھائی اور گھر کے دوسرے لڑکے اور لڑکیاں مدرسہ جا رہے ہیں۔ تو انھوں نے بھی ضد شروع کی۔ گھر کے ہر فرد نے سمجھانے کی کوشش کی مگر بے سود۔ گھر پر جو اُستاد پڑھایا کرتے تھے انھوں نے کہا "آج تم مدرسہ جانے کے لئے چلّا رہے ہو۔ ایک وہ دن بھی آئے گا کہ تم مدرسہ چھوڑنے کے لئے اس سے زیادہ چلّاؤ گے۔" ٹیگور کہتے ہیں "اس سے زیادہ صحیح پیشین گوئی میں نے اپنی عمر میں نہیں سُنی۔"

سب سے پہلے یہ "اورینٹل سیمنری" میں داخل ہوئے جبکہ ان کی عمر مدرسہ کے قابل بھی نہ تھی۔

نارمل اسکول

"اُورینٹل سیمنری" میں یہ زیادہ دن نہ رہ سکے کیونکہ جب یہ نارمل سکول میں داخل ہوئے اس وقت بھی بہت ہی کم سن تھے، یہاں کی آب وہوا بھی ان کے موافق نہوئی۔ یہاں بھی ذریعہ تعلیم انگریزی تھا۔ شریر اور بدقماش لڑکوں کا اجتماع، اُستاد کا وحشیانہ برتاؤ اور بدزبانی ان سب اسباب نے بچہ کے دل میں تعلیم اور مدرسہ سے رغبت پیدا کرنے کی بجائے نفرت کا شدید جذبہ پیدا کیا۔ درس کے اوقات میں یہ جماعت کے آخری کونے میں بیٹھا کرتے، اور وقفوں میں سب سے الگ تھلگ خاموش اِدھر اُدھر گھوما کرتے۔

لطیفہ علم اور دولت کے ساتھ ساتھ حسن بھی اس خاندان کے حصہ میں آیا ہے۔ یہ بھی رنگ روپ کے اچھے اور ناک نقشے کے ٹھیک تھے۔ پورے مدرسہ کے مرکز نگاہ بن گئے۔ اسکول کے لڑکے انہیں تاکا کرتے اور اس کوشش میں لگے رہتے کہ کاش اتنا ہی موقعہ ملے کہ بات ہی کر سکیں۔ ہمیشہ گھر میں عورتوں میں رہنے کی وجہ سے ٹیگھد بلا کے شرمیلے بن گئے تھے۔ مدرسہ کے لڑکے اس مغالطہ میں تھے کہ یہ لڑکی ہیں۔ اور مردانہ کپڑے پہنا کر مدرسہ بھجوائے جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک آزمائش بھی کی گئی چنانچہ بچپن کے اس واقعہ کو اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں خود بھی بیان کرتے ہیں۔ کہ اپنی شرمیلی طبیعت اور جماعت سے دُور دُور رہنے کی وجہ سے

جب یہ جنس کے معاملہ میں مشتبہ ٹھیرے تو سبھوں نے ملکر یہ تجویز کی کہ انھیں کدا کر دیکھا جائے کیونکہ مشہور ہے کہ جب مرد کودتا ہے تو دایاں اور عورت کودتی ہے تو بایاں پاؤں آگے رہتا ہے۔ بس ایک قدم پہ مرد اور عورت ہونے کا فیصلہ ٹھیرا۔ پاؤں کی ایک لغزش اور غلط قدم اندازی انھیں لڑکوں کی نظر میں لڑکی بنانے کے لئے کافی تھی۔ یہ کودے اور دایاں پاؤں ہی آگے رکھ کر کودے۔ یہ تمام کارروائی کچھ اس انداز سے طے پائی کہ انھیں مطلق خبر نہوسکی یہ کس تقریب میں کدائے جارہے ہیں۔ جب یہ آزمائش میں کامیاب اُترے تب لڑکوں نے انھیں اس بھید سے آگاہ کیا۔

مدرسہ کی کیفیتوں کا جب ان کے والد کو علم ہوا تو اُنھوں نے مکان پر خانگی اُستاد مقرر کیا جو بنگالی کا درس دیا کرتا تھا۔ یہاں یہ آزاد تھے کہ نصابی معین کتابوں کی بجائے اپنے مذاق کی کتابیں پڑھیں۔ بنگال کے وشنوا شاعروں کے تمام شاہکار دیکھ ڈالے، بنگالی کی قدیم اور جدید جتنی بھی کتابیں اور رسالے دستیاب ہوئے اُنھوں نے نہایت دلچسپی سے اُن کا مطالعہ کیا اور اپنی زبان اور ادب میں خاطرخواہ دستگاہ حاصل کی۔

ہمالہ پر والد کیساتھ سفر

ان کے والد مہارشی اُس پرندے کی طرح جو فضا میں اُڑتا رہتا ہے مگر اپنے بچوں کے گھونسلے پر آنکھ رکھتا ہے باوجود ہمیشہ سفر اور عموماً ہمالہ پر رہنے کے گھر سے بے خبر نہ تھے۔ ایک دفعہ وہ اپنے بیٹے کی زنار پوشی کی رسم میں کلکتہ آئے اور بچہ کو اپنے ساتھ ہمالہ لے گئے۔ اس وقت ٹیگور کی عمر گیارہ سال کی تھی یہ کلکتہ سے بالپور بالپور سے امرت سر پہنچے۔ جہاں ایک مہینہ سے زیادہ قیام رہا۔

مہارشی کے لئے موسیقی غذائے روحانی تھی، اس پیاس کو بجھانے کے لئے وہ روزانہ امرت سر کے سنہری مندر جایا کرتے اور وہاں مذہبی گیتوں میں خود بھی شریک ہوتے۔ روزانہ مکان پر گانے والوں کا جمگھٹا رہا کرتا تھا۔ رات میں جبکہ چاندنی مرمریں غبار اُڑاتے ہوئے تمام عالم پر پھیل جاتی تو راگ کے عاشق مہارشی اپنے فرزند ٹیگور سے گانے کی فرمائش کرتے۔ کائنات مجسم سکوت بنکر اس ننھے مغنی کے نازک گیت سُننے کے لئے ہمہ تن گوش بنجاتی۔

عین موسم بہار میں یہ ہمالہ پر پہنچے۔ امرت سر سے جب ہمالہ کا رُخ کیا تو راستہ میں فطرت کے دلفریب مناظر رابندرا ناتھ کا دامن کھینچے اور سرگوشیاں کرتے کہ جا اینجاست" جب منزل مقصود پہ پہنچے ہیں تو خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی کہ مدرسہ اور اُستادوں کی ہاؤ ہو سے دور ہمالہ کی چوٹیوں پہ آزادی کا سانس لے

رہے ہیں۔ والد نے انھیں اجازت دے رکھی تھی کہ جہاں چاہیں پھریں مہارشی تمام رات عبادت اور وظائف میں مشغول رہتے۔ بہت ہی سویرے رابندرناتھ جگائے جاتے۔ باپ کے ساتھ نماز اور اپنشدھ کے ورد کے بعد ناشتہ کرتے اور تمام دن پہاڑ کے دیو نما درختوں میں گھوما کرتے۔

مہارشی سفر میں بھی اپنے بیٹے کی تعلیم سے بے خبر نہ تھے، الا کہ تعلیموں کی تعلیم تو خود ان کا ساتھ تھا۔ پھر بھی جب رات ہوتی تو وہ انگریزی کا درس دیا کرتے، یا اولیاء اللہ کی زندگیوں کے حالات کہانیوں کے طور پر سناتے۔ جب اس سے فراغت ہوتی تو ان کا نوکر کشوری وشنوا شاعروں کی مثنویاں گا کر سناتا۔ یوں بھی ٹیگور وشنوا شاعروں کی گیتوں کے رسیا تھے ہمیشہ انھیں شوق سے پڑھا کرتے تھے، مگر یہاں انھیں ان قدیم اساتذہ کے کلام سے مستفید اور متاثر ہونے کا خوب موقع ملا۔ تھوڑے عرصہ بعد یہ کلکتہ واپس آگئے۔

شاعری کی ابتدا

ٹیگور نے آٹھ سال کی عمر ہی سے شعر کہنا شروع کیا۔ ایک نیلی بیاض ہمیشہ ساتھ رہتی تھی جو شعر یا نظم موزوں ہوئی اسے فوراً نقل کر لیا کرتے۔ شدہ شدہ ساتھیوں، استادوں اور گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ رابی شعر کہتا ہے۔ سب سے پہلی نظم جو انھوں نے لکھی۔ وہ کنول پر ہے۔ ان کے بڑے بھائی خوشی اور فخر کے ساتھ سب سے ٹیگور کا تعارف کراتے کہ دیکھو رابی نے نظم لکھی ہے۔ اور یہ خوش الحانی کے ساتھ اسے پڑھتے۔ سننے والے سب تعریف کرتے اور ہونہار و نوخیز شاعر کی ہمت بڑھاتے۔

گوندا بابو نے جو ٹیگور کے استاد تھے جو انھیں بہت چاہتے تھے ایک روز پوچھا "تو تم شعر بھی کہتے ہو؟" شاعر نے بغیر پس و پیش کے کہا ہاں" اس پر مہربان استاد نے ایک اخلاقی نظم لکھنے کی فرمائش کی۔ جب انھوں نے نظم لکھی تو بابو نے اعلیٰ جماعت کے لڑکوں کے سامنے ٹیگور کو بلا کر پڑھنے کے لئے کہا۔ کسی نے یقین نہ کیا کہ اتنی اچھی نظم اس بچہ نے لکھی ہے۔ بعض لڑکوں نے جلکر یہ بھی کہا "یہ نظم جہاں سے نقل کی گئی ہے ہم بتا سکتے ہیں" مگر ثبوت میں کچھ بھی پیش نہ کر سکے۔

اسی زمانہ میں ماگھ کے تیوہار کے موقع پر جو مناجاتیں گائی جاتی تھیں ان میں اکثر ٹیگور کی ہوتیں۔ ایک مناجات کا مصرع یہ ہے "آنکھ تجھ کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ جو ہر ایک کی آنکھ کی پتلی ہے" اس پر ٹیگور کے والد نے کہا "اگر

ملک کا بادشاہ اس شاعر کی زبان اور ادب کو جانتا تو ضرور انعام دیتا، چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے میں یہ خدمت انجام دوں گا۔" یہ کہکر ایک چک ان کے حوالہ کیا۔

بچپن کے ادبی رفقاء

یہ اس طبقہ کے بچوں میں نہیں تھے جو باہر پھرا کرتے ہیں، اس لئے مکان کے قیام نے انھیں باہر کے ہم عمروں کو دوست بنانے سے باز رکھا۔ وہی لوگ دوست یا رفیق کا کام دیتے جو ان کے بزرگوں کے ملنے جلنے والے تھے۔ انھیں میں سے ایک انگریزی ادب کے ایم۔ اے اکشیا چودھری ان کے بھائی کے ساتھی تھے۔ یہ ادب اور شاعری کے سچے عاشق تھے، باوجود انگریزی ادب میں غیر معمولی انہماک کے وشنوا شاعروں سے بھی بہت ذوق رکھتے تھے۔ ٹیگور کی شاعرانہ قوتوں کو بیدار کرنے میں ان کا بہت اثر ہے۔ یہ انگریزی اور بنگالی کے شعر مزے لے لے کر اپنے خاص انداز میں ٹیگور کو سناتے، ٹیگور کی ابتدائی شاعرانہ کوششوں پر تنقید و تبصرہ کر کے انھیں مفید ہدایتیں دیا کرتے۔

دوسرے ساتھی ان کے بڑے بھائی جیوتندرا ناتھ ٹیگور ہیں جو حفظ مراتب کا خیال کئے بغیر ٹیگور کو بالکل اپنا ساتھی سمجھتے تھے۔ ٹیگور کا حس موسیقی

پہلے ہی سے تیز تھا ان کی صحبت میں انھوں نے نئے نغموں کی تخلیق اور ان کو نظموں میں منتقل کرنا سیکھا۔ ان کے بھائی بعض اوقات دن کا بڑا حصہ پیانو پر صرف کرتے اکشیا چودھری اور ٹیگور آوازوں کے اُتار چڑھاؤ کی مناسبت سے الفاظ پُر کرنے میں مشغول رہتے۔

گھر کی دُلہن جو ابتدائے عمر ہی سے ٹیگور کی دوست تھیں مرتے دم تک ان پر مہربان رہیں یہ ادب کا صحیح ذوق رکھتی تھیں، کتابیں وقت گذاری کیلئے نہیں بلکہ جو کچھ پڑھا ہے اُسکو اپنا بنانیکے لئے پڑھتی تھیں ٹیگور کی ادبی سرگرمیوں کی یہ بھی شریک تھیں۔

انھیں دنوں دہاری لعل چکرورتی کی مسلسل نظمیں (سارداامنگل) آریا ورش میں شائع ہو رہی تھیں، ان کی بھاوج ان نظموں کی بڑی دلدادہ تھیں اکثر نظمیں زبانی یاد تھیں۔ بعض اوقات شاعر کو اپنے پاس مدعو کر کے شعر و سخن کی مجلسیں گرم کیا کرتیں۔ ٹیگور کو بھی اس شاعر سے دوستی کرنیکا موقعہ ملا۔ یہ جب کبھی شاعر کے مکان پہ جاتے تو وہ بڑے تپاک اور شفقت سے ملتا۔ اور مستانہ کیفیت میں ڈوب کر اپنی نظمیں انھیں سُناتا۔

اس وقت ٹیگور کی انتہائی آرزو یہ ہوتی "کاش میں بھی ایسا شاعر ہوتا۔"

ادبی زندگی کا آغاز

۱۸۷۵ء سے ۱۸۹۱ء تک

اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ ٹیگور کی شاعرانہ اور ادیبانہ کوششیں مکان کے

محدود حلقہ سے گزر کر منظر عام پر آجائیں گیا ناکڑ ایک ماہوار رسالہ ان کی تمام نظموں کو شائع کرنے لگا۔ ایک تنقیدی اور کسی قدر تاریخی مضمون نے بھی یہیں جگہ پائی۔ اس وقت عمر ۱۵ سال تھی۔

ان کے بڑے بھائی جیوتندرا ناتھ نے ایک ماہوار رسالہ "بھارتی" نکالنا شروع کیا تھا، ٹیگور بھی مجلس ادارت کے شریک بنائے گئے۔ یہ رسالہ اُن کی نظموں کے اظہار کا واسطہ بن گیا۔ اس دور کو ہم بھارتی کا دور بھی کہہ سکتے ہیں۔

ان کی ایک طویل نظم کوئی کہانی "سرگزشت شاعر"، "بھارتی" ہی میں نمودار ہوئی۔ یہ اس عمر کا نتیجۂ فکر ہے جبکہ لکھنے والا گرم و سرد زمانہ کا کچھ تجربہ نہ رکھتا تھا۔ ان کا یہ پہلا ادبی کارنامہ ہے جو کتابی صورت میں شائع ہوا۔

بھنو سنگھ

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں ان کے زیر مطالعہ وشنوا شاعروں کا کلام زیادہ رہا ہے اس لئے ابتدائی کلام بالکل چندی داس اور ودیاپتی کے رنگ میں لکھا گیا ہے۔ انھوں نے بھنو سنگھ کے فرضی نام سے چند نظمیں لکھیں۔ یہ زبان اسلوب اور خیالات کے لحاظ سے اتنے پاکیزہ اور ایسا قدامت کا رنگ لئے ہوئے تھیں کہ بالکل وشنوا شاعروں کا کلام معلوم ہوتا تھا۔ جو سنتا بے ساختہ

داد دیتا۔ جب زیادہ شہرت ہوئی تو انھوں نے کہا کہ ان نظموں کا لکھنے والا بھنو سنگھ نہیں، یہ خود ہیں مگر کسی نے یقین نہیں کیا۔ غرض ایک عرصہ تک یہ اپنے ہم وطنوں کو بیوقوف بنائے رکھے۔ یہ غلط فہمی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ ٹیگو۔ اس ضمن میں نشتی کنتا چٹرجی کا واقعہ بڑی دلچسپی سے بیان کرتے ہیں۔

صاحب موصوف کو جرمنی نے پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری اس کارنامہ کے صلہ میں دی کہ انھوں نے بنگالی اور یورپی شاعری (لریکس) کا تقابلی مطالعہ کر کے مقالہ پیش کیا تھا جس میں بھنو سنگھ کو بنگال کے ایک قدیم شاعر کی حیثیت سے بڑی عزت دی گئی تھی۔ حالانکہ بھنو سنگھ ٹیگور ہی کا ایک فرضی نام تھا۔

لندن کا سفر (۱۸۷۰)

ان کے بھائی احمد آباد کے جج تھے۔ ان کی بیوی بچے لندن میں مقیم تھے رابندرا ناتھ چند مہینے احمد آباد میں ٹھیر کر ۲۰ ستمبر کو اپنے بھائی کے ساتھ لندن روانہ ہوئے۔

وہاں کی دنیا ان کے لئے بالکل نئی تھی۔ اپنی گھریلو زندگی سے وہ ایک دم ایسی دنیا میں پہنچ گئے جہاں کے بسنے والے زبان، رنگ اور آداب وطرز معاشرت میں اُن سے بالکل مختلف تھے۔ اس سفر کا مقصد بیارسٹری کا امتحان پاس کرنا تھا۔ مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکے۔ قیام لندن کے زمانہ میں

اور مدرسوں کے علاوہ یونیورسٹی کالج میں انگریزی ادب کی تعلیم پاکر انگریزی ادب سے متاثر ہوتے رہے۔ ایک سال کے بعد پھر ہندوستان واپس آئے۔

یہ سفر ان کی ادبی سرگرمیوں میں کوئی وقفہ نہیں پیدا کیا۔ بلکہ مشغولیتیں آتے تک برابر جاری رہیں۔ نظم سے زیادہ نثری کارنامہ اس دور کا زیادہ قابل لحاظ ہے۔ دوران اور قیام سفر میں انھوں نے ایک سلسلہ خطوط کا لکھنا شروع کیا جو مسلسل "بھارتی" میں شائع ہوتے رہے۔ خط نویسی میں ان کو اچھا ملکہ ہے۔ ان کے خطوط ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔

"دل شکستہ" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کی ابتدا ابتدا سفر ہی سے ہو چکی تھی مگر ہندوستان میں آکر اس کی تکمیل ہوئی۔ "بھارتی" میں نمودار ہوئی۔ اور بہت مقبول ہوئی۔ اس نظم اور اپنے اس دور پر شاعر خود تیس سال بعد ان الفاظ میں تنقید کرتا ہے۔ "جب میں نے "دل شکستہ" لکھنا شروع کیا میں اٹھارہ برس کا تھا۔ جبکہ میں نہ پورا جوان تھا اور نہ پورا بچہ۔ یہ عمر صداقت کی راست شعاعوں سے منور نہیں ہوتی بلکہ اس کی جھلکیاں کہیں کہیں دکھائی دیتی ہیں۔ اور باقی سب سایہ ہے۔ غروب آفتاب کے وقت کے سایہ کی طرح اس کے تصورات دراز اور موہوم ہیں جو حقیقی دنیا کو وہم میں تبدیل کرتے رہیں۔ اس زمانہ کا دلچسپ حصہ یہ ہے کہ نہ صرف میں بلکہ آس پاس کے ہر شخص کو مجھ جیسا اٹھارہ سالہ سمجھتا تھا۔ اور ہم سب بے بنیاد اور غیر موجود تخیلی دنیا کی طرف جا رہے تھے جہاں کہ بہت ہی شدید مسرت اور غم بھی ایک خواب کی دنیا کی مسرت اور غم معلوم ہوتا تھا۔ میری عمر کا ۱۵ یا ۱۶ سے ۲۲ یا ۲۳ سال کا زمانہ بالکل غیر منظم زمانہ ہے۔"

صبح کے گیت اور شام کے گیت

جب اپنے نفس اور خارجی دنیا میں عدم مطابقت ہوتی ہے تو انسان دل میں ایک درد محسوس کرتا ہے الفاظ سے زیادہ آہ اور چیخ ہی اس سوزنہانی کی ترجمانی کرسکتے ہیں۔ شاعر ٹیگور اب شباب کے جس دور سے گزر رہے تھے وہ سن کے لحاظ سے کوئی غیر معمولی چیز نہیں تھا۔ "شام کے گیت" اور "صبح کے گیت" اس دور کے مختلف نظموں کے مجموعے ہیں جو شاعر کے قلبی کیفیات کی تلاطم خیزیوں کا اچھا مرقع ہیں۔

"شام کے گیت" کے عنوانات ہی اس کا پتہ دیتے ہیں کہ شاعر کے دل میں کتنا درد اور حزن بھرا ہوا ہے۔ "ناامیدی امید" "ایک ستارے کی خودکشی" "دعوت حزن" "بے دل کی عورت" "دل کا مرثیہ" اب اُن کے کلام میں انفرادیت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے انقلابی اور جدید رومانی شاعر کی حیثیت سے ان کا وقار قائم ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر سیل جو بڑے نقاد ہیں ان نظموں کے متعلق لکھتے ہیں "یہ نظمیں موضوع اور جذبات کی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستانی شاعری میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔"

ساتھ ہی ساتھ یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ ان کی شاعری کی تعمیر کا بالکل ابتدائی زمانہ ہونے کی وجہ سے باوجود اپنے محاسن کے یہ نظمیں سقم سے بالکل خالی نہیں ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی کلام میں تنوع کا فقدان

اور تکرار خیال کی زیادتی نمایاں

بتلائی جاتی ہے۔

دو موسیقیانہ طربیئے امیوزیکل کامیڈیز(۱) جو ہر والمیکی ا دی جینس آف والمیکی)(۲) خطرناک شکار (دی فیٹ فل ہنٹ) اس قنوطی کیفیت کو توڑتے ہیں۔

جو ہر والمیکی ۔ اس ڈرامہ کا پلاٹ والمیکی کے قصہ سے لیا گیا ہے۔ والمیکی پہلے ایک ڈاکو تھا۔ سارس کے جوڑے کے دردناک واقعہ سے متاثر ہوکر موزوں الفاظ میں اس نے نوحہ لکھا۔ سارس کا واقعہ یہ تھا کہ کسی شکاری نے سارس کے ساتھی کو مار دیا تھا اور وہ اکیلی تھی۔ والمیکی نے رامائنہ بھی اسی بحر میں لکھی ہے ان کے یورپ جانے سے پہلے گھر میں عموماً ایسی مجلسیں ہوتی تھیں جہاں باذاق لوگ جمع ہوا کرتے تھے اور مہمانوں کی غنا اور دوسری مفرحات سے ضیافت کیجاتی تھی۔ جب یہ یورپ سے واپس آئے تو ایک ایسی ہی آخری مجلس منعقد ہوئی اس موقع کے لئے یہ ڈرامہ لکھا گیا تھا۔ والمیکی کا پارٹ خود ڈاکٹر ٹیگور نے ادا کیا اور ان کی بھتیجی نے سرسوتی کا کام کیا تھا۔

گو اس ڈرامہ میں بعض نظمیں واقعی شاعرانہ خوبیاں رکھتی ہیں مگر پورے کا پورا ڈرامہ وقعتہ اثر پیدا کرنے والا ہے۔ جس میں محض موسیقی کی خاطر الفاظ جڑ دیئے گئے ہیں۔ اس کو تو اسٹیج پر دیکھنے اور سننے ہی میں مزا آتا ہے۔ یوں پڑھیں تو کچھ زیادہ لطف نہ آئیگا۔ اس ڈرامہ میں کچھ نظمیں اکشیا بابو کی بھی ہیں اور کچھ دہاری لال چکرورتی کے سارد امنگل سے ماخوذ ہیں۔

پہلے ڈرامہ کی کامیابی نے انھیں دوسرا ڈرامہ لکھنے کی ہمت بندھائی۔

خطرناک شکار: اس ڈرامہ میں وسرتھ کے ہاتھوں سادھو کے بیٹے کے قتل کا قصہ ہے۔ جب اسٹیج کیا گیا تو پبلک بہت متاثر ہوئی۔

موسیقی رابندرا ناتھ کی رگ وپے میں سرائت کئے ہوئے ہے نئے نئے راگ بنانے اور ان کو لفظی جامہ پہنانے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ جس کا مظاہرہ اُن کے کلام سے ہوتا ہے۔ پھر یہ ڈرامے اس وقت لکھے گئے جبکہ گھر میں موسیقی کے چشمے اُبل رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوائے موسیقی کے کوئی اور مشغلہ نہیں تھا یہی اسباب تھے جس کی وجہ سے وہ موسیقانہ طربیے پیدا ہوئے جس میں موسیقی کے کمالات کا خوب اظہار رہا ہے۔

ان ڈراموں میں آئرستانی شاعر ٹامس مور کا اثر بتلایا جاتا ہے۔ غالباً ان ڈراموں کے لکھنے کے محرک بھی آئرش میلوڈیز ہی ہیں۔ کیونکہ انگلستان جانے سے پہلے اکشیا بابو کی صحبت میں آئرش میلوڈیز کی مصور جلد پڑھنے کا انھیں اتفاق ہوا تھا جس نے شاعر کے دماغ پر قدیم آئرستانی تہذیب کا ایک موہوم سا نقش جما دیا۔ آئرستانی موسیقی سے لطف اندوز ہونے کی خواہش شدت کے ساتھ ان کے دل میں جگہ پا گئی تھی۔ جب یہ ولایت گئے تو یہ آرزو بھی پوری ہوئی۔ اور کئی راگ بھی سیکھے۔ ان طربیوں میں انہیں راگوں کو داخل کیا گیا ہے۔ ہندستانی اور آئرستانی راگوں کے امتزاج سے ایک نئی کیفیت پیدا کی جس کی ان سے پہلے کسی نے ہمت نہیں کی۔

اس کے بعد ہی "صبح کے گیت" آتے ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہت ہی بلند تفکر اور تخئیل کی حامی ہیں۔ اس مجموعہ میں نظموں کے بعض عنوانات یہ ہیں

"کائنات کا خواب" "زندگی کی سرمدیت" "فطرت سے اتحاد" "اپنے خواب سے جاگا ہوا فوارہ" "نغمہ۔ محبت۔ زندگی" اس آخری نظم کی نسبت ڈاکٹر سیل کہتے ہیں کہ اپنی رفعت کے اعتبار سے گوئٹے کی تھری رورنس سے کچھ ہی کم ہے۔ یہ نظمیں بندش کی چستی اور اسلوب کی روانی میں اپنی پیش رو نظموں کے مقابلہ میں امتیازی برتری رکھتی ہیں اور شاعر کے آئندہ رجحانات کا پتہ لگانے میں مدد دیتی ہیں۔ اپنے اچھوتے انداز میں جو اس وقت بہت مقبول تھا انھوں نے ایک کتاب بیدھا پراسانگا" (مختلف موضوع) لکھی جس میں معنوی حسن سے زیادہ اسلوب بیان کی نمائش کی گئی ہے۔ ایک ناول "بھتا کرا بزہات" بھی جس کو یہ اپنا پہلا ناول تسلیم کرتے ہیں اسی زمانہ میں نکلا یہ دوران کی ادبی زندگی کا دیباچہ تھا جو ان نظموں اور دوسرے ادبی کارناموں پر ختم ہوا۔

دور دوم

۱۸۸۴ سنہ سے ۱۹۰۰ سنہ تک

شادی اور کاروار کا قیام

جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں، یہ انگلستان بارسٹری کی تکمیل کے لیئے گئے تھے، مگر پہلی مرتبہ اس مقصد میں ناکام واپس آگئے تھے، دوسری بار پھر جانے کی تحریک ہوئی، اور اہتمامات ہو گئے۔ اپنی رخصت کے ایک دن پہلے انھوں نے موسیقی پر عام جلسہ میں ایک پرچہ بھی پڑھا۔

اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ یہ جاتے جاتے رہ گئے اور مدراس ہی سے مکان واپس ہونا پڑا۔ ان دنوں (۱۸۸۳) ان کے بھائی کاروار میں جج تھے، یہ وہیں چلے گئے، مناظر فطرت جس کی محبت بچپن ہی سے ان کے دل میں تھی وہاں موجود تھے، انھوں نے خود کو کالندے ندی کے کنارے کشتی کی سیر اور چاندنی راتوں کے حوالہ کر دیا۔ اسی سال ڈسمبر میں ان کی شادی ہوگئی جبکہ یہ عمر کی ۲۳ تئیسویں منزل میں تھے، جہاں سے ان کی زندگی میں ایک نئے باب کا افتتاح اور عملی زندگی سے مقابلہ کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

کاروار ہی کے قیام میں انھوں نے اپنا پہلا غیر زمزی ڈرامہ
(نان سمبالک)، "سنیاسی" لکھا۔ کلکتہ واپس آنے کے بعد ایک طویل سلسلہ موسیقانہ
نظموں (لریکل پوئمس) کا لکھنا شروع کیا،
جو "مصوّر نغمے" کے نام سے شائع ہوا۔ ان نظموں میں تغزل اور موسیقی ایک
دوسرے سے ایسے گھُلے ملے ہیں کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہے کہ زبان اور جذبات کی
خوش آہنگی اور شگفتگی ہمیں مسحور کر رہی ہے یا ان کا سُریلا پن۔
یہ زمانہ عجیب ہنگامہ خیز زمانہ تھا۔ ان کی ذہنی قوتیں پورے بہار پر
تھیں۔ تحریر اور تقریر دونوں طریقوں سے یہ اپنی دماغی پیداوار کو
پیش کر رہے تھے، نثر اور نظم کی نہریں پورے جوش اور تیزی کیساتھ
بہہ رہی تھیں، ہر شخص کی زبان پر انھیں کا نام تھا اور ہر جگہ انھیں کے
چرچے تھے۔ "مباحثے" کے نام سے مختلف تنقیدی مضامین لکھے جس سے
اب تک بنگالی ادب خالی تھا۔ "راجارشی" اسی زمانہ کا ناول ہے جس کا
پلاٹ بعد میں ان کے ڈرامہ "قربانی" میں استعمال کیا گیا "مایا کھیلا" ایک
موسیقانہ ڈرامہ بھی اسی دور کی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے جو "والمیکی" سے
بہت مشابہت رکھتا ہے، ایک اور جلد "مباحثوں" کی نکلی جس میں زیادہ تر
سیاسی، تعلیمی، اور معاشرتی، اصلاحی مضامین تھے جو مختلف موقعوں پر عوام میں
تقریر کے ذریعہ پیش کئے گئے تھے۔ ادبی حلقہ میں ان کی شخصیت بہت ہی
ممتاز اور نمایاں مرتبہ حاصل کر لی تھی قدیم مذہبی بے جا اعتقادات کی
مخالفت کی وجہ سے جس کی ابتدا ان کی ایک تقریر "ہندو شادی" سے ہوتی ہے

مگر محض پلاٹ کی خاطر قصہ نہیں لکھتے بلکہ وہ جس حقیقت کو پیش کرنا چاہتے ہیں اُس تک پہنچنے کے لئے وہ ذریعہ ہوتا ہے جس کی تعمیر میں شاعرانہ تخیل اور زندگی کی عام صداقتوں کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان کے کردار کسی اور طلسماتی دنیا کے کردار نہیں ہوتے بلکہ وہ سب اسی دنیا کے ہوتے ہیں جس میں ہم بستے ہیں، وہ بالکل چلتے پھرتے جیتے جاگتے انسان معلوم ہوتے ہیں جن میں زندگی کی روح بھری ہوئی ہے۔

فطرتِ انسانی اور مناظر قدرت کی مختلف النوع کیفیات کا مطالعہ کرنا ہو تو ٹیگور کے فسانوں سے زیادہ اور کوئی چیز موزوں نہیں ہو سکتی۔ مناظر فطرت گو پس منظر (بیک گراؤنڈ) کی حیثیت سے ان کے فسانوں میں داخل ہوتے ہیں مگر وہ مردہ نہیں ہوتے مصنف کی نظر میں فطرت بذات خود ایک جاندار وجود ہے جس کی زبان بھی ہے جس کو وہ سمجھتا ہے، اسی کی ترجمانی فسانوں میں بھی ہوتی ہے۔

عورت اور پھر ہندستانی عورت عموماً ان کے افسانوں کی روح رواں ہوتی ہے۔ ہندستانی عورت کی وفا شعاری، ایثار اور قربانی کے جذبہ کو مختلف ڈھنگوں سے بیان کرتے ہیں، گو اب ستی کی رسم یہاں باقی نہیں رہی مگر ایثار اور قربانی کے جذبہ نے دوسری اور شکلیں اختیار کر لی ہیں۔ جس کی وجہ سے ہندستانی خاندان مسرت و انبساط کا سرچشمہ بنا رہتا ہے۔ ٹیگور کے فسانوں میں عورت کا کردار بہت ہی روشن ہوتا ہے ہمیشہ عورت ہی ہوتی ہے جو دنیا کو حقیقت اور مسرت کی طرف لوٹاتی ہے۔ اردو رسالوں میں آئے دن ٹیگور کے افسانوں کے ترجمے شائع ہوتے رہتے ہیں، قارئین کرام کو ان کے مطالعہ سے

ان کے افسانوں کی خصوصیات کا پورا اندازہ ہوگا۔ ٹیگور غالب کی طرح عام سطح سے بلند رہنا چاہتے ہیں۔ اُس زمین پر قدم رکھنا نہیں چاہتے جو پامال ہو چکی ہو۔ یہ بات اُن کی ہر تصنیف بلکہ ہر تخیل اور اسلوب بیان میں صاف نظر آتی ہے۔ اسی معیار پہ ان کے قصے، کہانیاں بھی پورے اترتے ہیں۔ ان میں بھی بجائے پیچیدہ پلاٹ اور بے جا رنگینی بیان کے ٹیگور کا پُر زور تخیل متین اور پُر رعب انداز بیان کام کرتا ہے۔

ڈرامے

ان کے ابتدائی اور غیر رمزی ڈرامے اسی دور سے متعلق ہیں۔ چترا جو ایک ڈرامائی نظم آپ اپنی مثال ہے، ان کے اور کاموں میں جس کا مرتبہ بہت بلند ہے اور جو محض آرٹ کی خاطر کے اصول پر لکھی گئی ہے اسی زمانہ کا نتیجہ ہے۔ چترا اگر بہترین نظم ہے تو "قربانی" بنگالی ادب کا سب سے بڑا ڈرامہ ہے، یہ بھی اسی دور میں لکھا گیا۔ دو اور ڈرامے "راجہ رانی" اور "مالنی" اسی زمانے میں لکھے گئے جو ادکاری سے زیادہ خیالات کے اظہار کا آلہ ہیں۔

یہ ڈرامے ہمیں بتاتے ہیں کہ شاعر کا دماغ ہندیت کے مختلف مسائل پر کس شدت سے کام کر رہا ہے:۔

چترا۔ محض جسمانی حسن کی شکست کو ظاہر کرتا ہے۔

راجہ رانی۔ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیسے خودغرض محبت، غم اور تباہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

قربانی۔ ابدی صداقت کا راستہ بتاتا ہے۔

مالنی۔ ہمیں سکھاتا ہے کہ خدا کی عبادت نام ہے صرف جذبہ فتادگی عجز و نیاز اور محبت کا نہ کہ ظواہر پرستی، اور بے روح مراسم کا۔ ان تمام ڈراموں میں عورت کا کردار بہت ہی بلند اور ارفع ہے۔ صرف عورت ہی ہے جو مرد کو گمراہیوں سے صداقت کی طرف لاتی ہے۔

رابندرانا تھ کی ادبی مشغولیتیں اتنی ہمہ گیر ہیں کہ کوئی ایسی صنف ادب نہیں جس میں انھوں نے طبع آزمائی کر کے اُسے مالا مال نہ کیا ہو۔ شعر، ڈرامہ، ناول، مقالہ، تقریر، خطبہ غرض ہر شعبہ ادب ان کا مرہون منت ہے۔ خودی کے اظہار کے جتنے بھی ممکنہ ذرائع ہو سکتے ہیں انھوں نے استعمال کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصانیف کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اگر صرف اُنھیں کی لکھی ہوئی کتابوں کو جمع کیا جائے تو اچھی خاصی الماری بھر سکتی ہے اور پڑھا جائے تو عمر کا کافی حصہ انہیں کی کتابوں سے بہلایا جا سکتا ہے۔

غیر بنگالی دنیا صرف انہیں ادبی کارناموں سے روشناس ہے جن کے انگریزی اور دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہوں، حالانکہ ایک حصہ ان کی تصانیف کا ایسا بھی ہے جو محتاج ترجمہ ہے۔

رابندرانا تھ پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں جبکہ کلکتہ میں مقیم تھے گھر کی ادبی تقریبوں کے لئے ڈرامے لکھا کرتے تھے اور تمثیلوں میں خود بھی اداکار کی

حیثیت سے حصہ لیتے تھے۔ "والمیکی" اور "خطرناک شکار" پہلے ابتدائی ڈرامے ہیں جن کی توضیح گذشتہ صفحات میں ہو چکی ہے۔ یہاں صرف ان ڈراموں کا ذکر مقصود ہے جو عالمگیر شہرت اور مقبولیت رکھتے ہیں۔ اور جن کا پایہ ادبی حیثیت سے بہت بلند ہے۔

ان کے ڈرامے نہ صرف ہندستان اور دوسرے مشرقی ممالک بلکہ مغرب کے اکثر حصوں جیسے انگلستان، روس، یوگوسلوکیہ اور امریکہ میں بھی کھیلے جاتے اور قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ چنانچہ کورٹ تھیٹر لندن میں آئرستانی اداکاروں نے ان کے ڈرامہ "ڈاک گھر" "راجہ رانی" کو پیش کیا جس میں حتی الامکان ہندستانی ماحول کے ذریعہ ڈراموں کو اصلی روح میں ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی ڈرامے اٹلی، اور جرمنی میں بھی کھیلے جاتے ہیں۔

رابندرا ناتھ کے ڈراموں کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو غیر رمزی ڈرامے دوسرے رمزی ڈرامے۔ غیر رمزی ڈراموں میں موسیقانہ اور غیر موسیقانہ کی شاخیں بھی قائم ہو سکتی ہیں۔ غیر رمزی ڈراموں میں والمیکی۔ خطرناک شکار۔ سنیاسی۔ قربانی۔ مایا کھیلا۔ مالنی۔ چترا۔ راجہ رانی ہیں جو دور مجاز کی پیداوار ہیں جبکہ شاعر پر متصوفانہ اور حکیمانہ رنگ نہیں چڑھا تھا۔ رمزی ڈراموں میں ڈاک گھر۔ اندھیر نگر کا راجہ۔ حلقہ بہار۔ عید غزاں۔ راجا اور رو ڈآلینڈر (محبت کے پھول) داخل ہیں۔

ان کے ڈرامے اکثر آلۂ خیال ہیں جو حکمت اور فلسفہ سے بھرے ہوئے ہیں جن میں حیات انسانی، اور کائنات کے عمیق ترین مسائل سے بحث ہوئی ہے۔

پڑھنے والے اور دیکھنے والے کے لئے زندگی کے مسائل پر سوچنے کا موقع ملتا ہے۔
ان ڈراموں میں پیش نظر ایک مقصد ہوتا ہے جو عموماً روحانی ہے۔ یہ اپنے مقصد تک
پہنچنے کے لئے شاعرانہ طرز ادا اختیار کرتے ہیں، ان کے غیر رمزی ڈراموں سے
زیادہ رمزی ڈراموں میں شعریت زیادہ ہے۔ جب آپ ان ڈراموں کو پڑھینگے تو
یہ اتنے دلچسپ حکمت اور شعریت سے مملو رہیں گے کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ختم کئے بغیر
نہ چھوڑیں گے۔ ایک کائناتی صداقت اور حقانیت جو پورے ڈرامہ میں جاری و
ساری ہے اک عرصہ تک آپ پر مستولی رہے گی۔ مگر جب تمثیل دیکھیں تو شاید
مایوسی ہو کیونکہ یہ عام ڈراموں کی طرح اسٹیجی دلچسپیوں سے معرا ہوتے ہیں۔ یہ ٹیگور ہی پر
منحصر نہیں بلکہ اعلیٰ مفکرین اور شعراء کے ڈراموں کا یہی حال ہے۔ اے۔ ین۔ شا
گالسوردی کے ڈرامے بھی ظاہر بیں نظروں کو خشک معلوم ہوتے ہیں۔ ان ڈراموں کو
تمثیلی حالت میں دیکھ کر لطف اندوز ہونے والے خاص مذاق اور صلاحیتوں والے
لوگ ہوتے ہیں۔

ان کے ڈرامے یا تو سماجی ہیں یا تاریخی، جس کے افراد یا تو صنمیاتی ہیں یا
ہند قدیم کے ممتاز ہیرو۔ اگر روزمرہ زندگی کے کردار ہیں تو اس مجاز میں کوئی
نہ کوئی حقیقت ضرور پوشیدہ رہتی ہے۔ بعض ڈرامے تمثیلی (ایلی گاریکل) ہیں۔

چترا

چترا۔ شباب اشعار اور موسیقیت سے بھرا ہوا اعلیٰ ترین ادبی کارنامہ ہے۔

جس کا قصہ مہا بھارت سے ماخوذ ہے۔ ایک بادشاہ ہے جس کے کوئی لڑکا نہیں بلکہ ایک لڑکی ہے جس کا نام چترا ہے، بادشاہ نے اولادِ نرینہ نہ ہونے کی وجہ سے اپنی لڑکی ہی کو لڑکے کی طرح تربیت دلائی، اور اُسے فنونِ سپہ گری سے آراستہ کر کے اپنا مورث قرار دیا۔

کھیل کے ابتدائی منظر میں چترا کو مدن (خدائے محبت) اور وسانت (خدائے شباب) سے محو مکالمہ بتلایا گیا ہے۔ چترا اُن سے کہتی ہے کہ جب وہ ندی کے کنارے ہرن کے تعاقب میں پھر رہی تھی تو اُس نے ایک نوجوان کو دیکھا جو سُوکھے پتوں پر ایک درخت کے نیچے سُو رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ قوم کا ہیرو ارجن ہے جس کا خیال ہمیشہ چترا کے دل و دماغ پر چھایا ہوا رہا کرتا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ ارجن نے بارہ سال تک راہبانہ زندگی گذارنے کی قسم کھائی ہے۔ ایک جنگی عورت ہونے کی وجہ سے چترا کی یہ آرزو تھی کہ کسی نہ کسی روز مردانہ لباس میں ارجن سے مقابلہ کرے۔ مگر پہلی ہی نظر میں یہ دل دے بیٹھتی ہے۔ جب ارجن وہاں سے اُٹھ کر جانے لگا تو چترا کے منھ سے ایک حرف بھی نہ نکل سکا۔ اور وہ دم بخود دیکھتے ہی دیکھتے رہ گئی۔

دوسرے دن وہ اپنا مردانہ لباس پھینک دیتی ہے، اس کا وہ مردانہ گھمنڈ نسائی انفعالیت اور اعتراف شکست میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چوڑیاں، کڑے، کمر پٹا اور گلناری رنگ کی ساری زیب تن کر کے مجسم نسائیت بن کر دھڑکتے ہوئے دل سے ارجن کی تلاش میں شوا کے مندر میں جاتی ہے۔ اور اُس کو مغلوب کرنے کیلئے اپنی ترکش کے پورے تیر چلاتی ہے مگر ارجن پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ آخر وہ اپنی

قسم یاد دلاتا ہے۔ چترا اپنے دل میں شکست اور خجالت کا احساس لئے ہوئے مدن (خدائے محبت) کی بارگاہ میں سربسجود ہو کر مدد مانگتی ہے۔ اور وہ ارجن کو اُس کے قدموں پر لا ڈالنے کا وعدہ کرتا ہے۔ پھر وہ خدائے شباب (وسانتا) کے حضور میں پہنچکر التجا کرتی ہے کہ کم از کم ایک دن ہی کے لئے اُس سے مردانہ پن چھین کر نائی رعنائی میں عطا کرے تاکہ وہ اپنے مرکز محبت اور اپنی دنیائی تمنا کو پا سکے۔ چترا کے دعائیہ کلمے یہ ہیں "صرف ایک دن کے لئے مجھے حسین ترین بنا دے۔ مجھے مکمل حُسن کا صرف ایک ہی دن عطا کر۔"

سدھنا

اس دور کا سب سے زیادہ نمایاں کام "سدھنا" کا اجرا ہے، یہ بھارتی کا جائے نشین ایک ماہوار رسالہ تھا جو تقریباً پورے کا پورا ٹیگور ہی کی جنبش قلم کا نتیجہ ہوتا تھا۔ اس دور کی سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی سرگرمیوں کی جولاں گاہ اور ان کی تعلیمات اور خیالات کے اظہار کا ذریعہ یہی رسالہ تھا۔

اب ان کی زندگی میں سیاسیات کا جزو شامل ہو کر ان کی شاعرانہ اور ادیبانہ جد وجہد کا دوسرا رُخ پیش کرتا ہے۔ اب تک یہ سیاسیات کی آلودگیوں سے اپنا دامن بچائے رکھ کر سروشِ سخن سے ہم کنار تھے۔ مگر ہندستان اور خصوصاً بنگال میں سیاسی تحریکات کا غلبہ تھا۔ ملک کا ہر فرد سیاسی گرداب میں گھرا ہوا تھا۔

ناممکن تھا کہ ٹیگور اس لپیٹ میں نہ آتے، وہ سیاسی دنیا میں اپنی سیاسی اور وطنی نظموں کے ساتھ داخل ہوئے جو ملک اور خصوصاً طالبعلموں کے طبقہ میں مقبول ہو کر ایک تازیانہ کا کام کیا۔ سیاسیات کے میدان میں ان کا طرزِ عمل ایسا عجیب تھا کہ حکومت اور اہلِ ملک دونوں سمجھنے سے قاصر تھے، یہ دونوں کو برا کہتے اور دونوں کی نظر میں یہ مشتبہ تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ حریت اور صداقت کے پیرو تھے۔ جب یہ دیکھتے کہ حکومت ملک کے جائز مطالبات کو ٹھکرا رہی ہے تو حکومت کو کھری کھری سناتے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کے ہم وطن بھی تنگ نظری اور غلط اصول کار کی بنا پر ان کی تلخ تنقیدوں سے بچ نہ سکتے تھے۔

یہ کانفرسوں اور کانگرسوں کو حقارت کی نظر سے اس وجہ سے دیکھا کرتے تھے کہ ہندستانی نمونے ہوتے ہوئے یہ ادارے مغرب کی تقلید میں قائم کئے گئے ہیں اور یہ باتیں ہم وطنوں کو بری معلوم ہوتیں وہ اس تقلید کے طوق سے گلوخلاصی کر کے آزاد شاہراہ کے ذریعہ منزلِ مقصود تک پہنچنا چاہتے تھے مگر زمانہ کی نامساعدت کیوجہ سے وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔ باوجود اس مخالفت کے وہ ان سیاسی انجمنوں کے ممبروں پر پیش پیش رہ کر تحریر و تقریر کے ذریعہ پُرجوش طریقہ پر حصہ لیتے۔

سیاسیات کے میدان میں قدم رکھنے کا نتیجہ تھا کہ ملک اور قوم کو اُبھارنے کیلئے وہ ہند قدیم کی عظمت رفتہ کی داستان کو دُہرانے لگے خصوصیات کیساتھ مرہٹوں اور سکھوں کی شجاعت کے کارنامے انکی شاعری کا موضوع بن گئے۔ بنگال میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ٹیگور کی ادبی خدمات کو

بہ نظر استحسان نہیں دیکھتا تھا خصوصاً شاعری کی ان ہاں کوئی وقعت نہیں تھی ایسے لوگ قدیم روش والے تھے۔ ایسی مخالفت کوئی نئی بات نہ تھی کیونکہ ہر زمانہ میں ہر جدید تحریک کی مخالفت ضرور کی گئی ہے کیونکہ رابندر ناتھ نے اپنی اجتہادی قوت سے بنگالی ادب میں ایک انقلاب پیدا کیا تھا اسلئے ایک مخالف طبقہ کا پیدا ہونا ضروری تھا۔

۱۸۹۷ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان انھوں نے چار اہم کتابیں "کالپانا" "کتھا" "کہانی" "کشانکا" لکھیں۔ آخری کتاب بہت اہمیت اس وجہ سے رکھتی ہے کہ پہلی مرتبہ اس میں عام بول چال کو شاعری کی زبان بنایا گیا تھا اس اجتہاد پر پنڈت نما لوگ بہت چراغ پا ہوئے مگر اتنا ہی شاعر نے اپنی نظموں میں اُن کی گت بنائی ہے۔ کتھا کہانی مثنویاں ہیں جس میں زیادہ تر بدھ۔ سکھ اور مرہٹوں کے رزمیہ کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ کالپانہ ایک وداعیہ ہے جس میں شاعر اپنے نفس اور اپنی گذشتہ شاعری کو خدا حافظ کہتا ہے۔

مذہبی شاعری کا آغاز

سونار تاری (سونے کی کشتی) ان کے موسیقانہ نظموں کے مجموعہ کی اشاعت سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر کے شعری، اور ذہنی رجحانات کا دھارا

مجاز سے حقیقت کی طرف مڑ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ ان کی زندگی اور شاعری پر مذہبی رنگ چڑھنا شروع ہوتا ہے اور متصوفانہ شاعری کی ابتدا ہوتی ہے اب تک ان کے معتقدات مذہبی کسی خاص اصول پر مبنی نہ تھے بلکہ ان کا مذہب وہی تھا جو عموماً اور ادیبوں کا ہوتا ہے۔ محبت اور مسرت ہی ان کا دین تھا جو تمام کائنات میں جاری اور ساری ہے۔

ابتدا ہی سے ان کا گھر مذہب کا مرکز رہا ہے۔ ان کے والد مہارشی کا وجود اور راجہ رام موہن رائے کی تعلیمات برابر غیر شعوری طور پر شاعر کی شخصیت پر اثر انداز ہو رہی تھیں۔ اب ان کی نگاہوں سے حجابات اٹھ گئے تھے اور حقیقت کو بے نقاب دیکھ رہے تھے۔ وہ ابتدائی کیفیات سے گذر چکے تھے۔ جب تخلیقی قوتیں تھک جاتی ہیں تو پھر آرٹ روحانی تشنگی کو بجھا نہیں سکتا، اس لئے رابندرا ناتھ ٹیگور نے مذہب کے دامن میں پناہ لی۔ اب ان کی شاعری مذہب اور تصوف کے نقاب میں جلوہ گر ہونے لگی۔

آشرم

سنہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک

یہ دور بھی اہم ہے کیونکہ سدھنا کی مسدودی کے بعد ایک اور ماہوار رسالہ بنگال ریویو اسی سال سے ان کی زیر ادارت شروع ہوا اور مستقل ناول نویسی کا دور یہیں سے شروع ہوتا ہے، اسی سال انھوں نے بالپور میں اپنے آشرم کا سنگ بنیاد رکھا جو بعد میں مدرسہ اور پھر بین الاقوامی جامعہ کی صورت اختیار کر لیا۔

اس آشرم کے افتتاح کے وقت ان کا خیال کچھ اور ہی تھا قوم اور ملک کی منتشر حالی کو دیکھتے ہوئے وہ ایسا مرکز چاہتے تھے جہاں سے یہ اطمینان ملک اور قوم کے لئے کوئی مناسب نصب العین کے تحت تعمیری کام کر سکیں دنیا سے الگ رہ کر دنیا کے لئے کام کرنے کا خیال دماغ میں جاگزیں تھا۔

بالپور میں جہاں اب جامعہ "شانتی نکیتن" (دارالامن) واقع ہے وہ مقام ہے جہاں شاعر کے والد مہارشی ایک چبوترے پر بیٹھکر ریاضت اور

مراقبوں میں مشغول رہا کرتے تھے۔ مہارشی کو یہ مقام بہت پسند آیا۔ یہاں انھوں نے ایک مکان باغ اور نگین کانچ کے دروازوں کا ایک مندر بھی تعمیر کرایا جس کی پیشانی پہ یہ عبارت لکھی ہوئی ہے "ہر صبح اور شام۔ سال کے ہر دن میں خدائے واحد کی عبادت کی جائے"۔ اس عبادت گاہ کے دروازے ہر اُس شخص کے لئے جو تزکیۂ نفس کے لئے آنا چاہتا ہے کھلے ہوئے تھے۔ مدرسہ کے وجود میں آنے سے پہلے یہ مقام خانقاہ کے نام سے موسوم تھا۔ اس مندر کے وثیقہ وقف میں حسب ذیل عبارت درج ہے جس سے اس خاندان کے مذہبی اعتقادات کا پتہ چلے گا۔

"یہ عمارت اس غرض سے تعمیر کی گئی ہے کہ اس میں بلا تفریق مذہب وملت ہر قسم کے ایسے لوگ جمع ہوا کریں جن کا باہمی سلوک شریفانہ متین، اور نیک ہو۔ اور جو الہامانہ مذہبی عقائد کے ساتھ اُسی ایک خدا کی پرستش، اور تسبیح اور تقدیس کیلئے جمع ہوا کریں جو ازلی اور ابدی ہے، جس کو عقل انسانی کی تلاش سے نہیں پایا جاسکتا۔ جو نقائص سے منزہ ہے جس کی ذات اس عالم موجودات کی خالق اور محافظ ہے۔ اور جسے اس نام کے علاوہ کسی اور نام سے مخاطب نہیں کیا جاسکتا جو کسی اور قوات کے لئے بولا جاتا ہو۔ اس عمارت میں کسی قسم کا کندہ کردہ مجسمہ، تصویریت، نقاشی کی شکل کی کوئی انسانی یا کوئی ایسی چیز جو ان سے ملتی جلتی ہو ہرگز داخل نہیں کیجائیگی"۔ ان کے مذہبی عقائد یہ ہیں:۔

۱۔ خدائے واحد کی پرستش کیجائے۔

۲۔ خدا کے کسی خاص اوتار کی پیروی نہ کیجائے۔ بت پرستی کی مخالفت کیجائے۔

یہ اور بھی موضوعِ بحث بن گئے۔

سنیاسی (انتقام فطرت)

ان کا یہ ابتدائی ادبی کارنامہ نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے یہی وہ ڈرامہ ہے جس کی وجہ سے عصر جدید کی تحریک رومانیت میں ان کا مرتبہ قائم ہوا "سنیاسی" یا "انتقام فطرت" ایک ڈرامائی نظم ہے جو انانیت اور میں پن کا بہترین مرقع ہے۔ اس کھیل کا مرکزی کردار ایک سنیاسی ہے جو دنیا اور دنیا والوں کو حقارت کی نظر سے ٹھکرا کر اسرار الٰہی کے انکشاف کی جستجو اور اکملیت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ خودی کی نجات کے لئے وہ پوری دنیا سے منہ موڑ چکا ہے وہ خواہشات کو مار کر فطرت پر فتح حاصل کرنا چاہتا ہے کہ اُسے عرفان خودی حاصل ہو۔ بالآخر ایک لڑکی اُسے عالم مرتاضیت سے جذبات کی دنیا کی طرف واپس لاتی ہے، اس وقت سنیاسی محسوس کرتا ہے کہ لامحدودیت کی تلاش محدود ہی میں ہے، اور روح کی ابدی آزادی محبت ہے، یہ صرف محبت ہی کی روشنی ہے جو ہر محدود کو لامحدود میں تبدیل کرتی ہے۔ عقل و خرد کے نہیں بلکہ دل کے راستہ سے فطرت نے سنیاسی کو لامحدودیت کے قدموں پر گرا دیا جو محدود کے تخت پر متمکن ہے۔

اس ڈرامہ میں ایک طرف تو ماوراء سے بے خبر گاؤں والوں کی معاشرتی

دلچسپیاں اور مسرتیں ہیں اور دوسری طرف سنیاسی کی اپنی خود ساختہ لامحدودیت میں گم گشتگی ہے۔ جب محبت اس خلیج کو ملاتی ہے اور خاندان والے ملتے ہیں تو محدودیت اور لامحدودیت کی تمام قید و بند دور ہو جاتی ہے۔

یہ ڈرامہ دراصل خود مصنف کے اس دور کے قلبی کیفیات اور واردات کا ترجمان ہے جس سے وہ گذر رہا تھا۔ اور مصنف کے آئندہ ادبی کارناموں کیلئے مقدمہ کا کام دیتا ہے۔ کیونکہ رابندرا ناتھ نے اپنی تحریرات میں اسی پر زور دیا ہے کہ لامحدودیت کی تلاش اور اس کے حصول کی مسرت خود محدود میں مستور ہے۔

شیلدا

شعر و سخن کے سلسلہ کو منقطع کئے بغیر یہ کچھ دنوں کے لئے غازی پور کو اپنا مستقر بناتے ہیں جس دور سے یہ گذر رہے تھے وہ ایسا انقلابی دور تھا کہ وہ معاشرہ، رسم و رواج اور مذہبی مروجہ اعتقادات کے خلاف ایک ردعمل میں مشغول دکھائی دیتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے طنزیہ نظمیں لکھنا شروع کیں، کیونکہ اصلاح کا بہترین آلہ ہجو ہے۔

غازی پور چھوڑ کر ہندوستان سے پشاور تک بیل گاڑی میں سفر کرنیکا مصمم ارادہ کر چکے ہیں مگر ان کے والد مہارشی نے فیصلہ صادر فرمایا کہ انھیں اپنی جاگیر کا کام سنبھالنے کے لئے شیلدا جانا چاہیئے۔ پہلے تو یہ کام کے نام سے بہت گھبرا گئے مگر اپنے والد کے حکم سے سرتابی کی مجال نہ تھی، طبیعت پر جبر کر کے آخر شیلدا چلے گئے۔ شیلدا جانے سے پہلے دوسری دفعہ یورپ کا سفر کیا جہاں یورپی اور جرمن موسیقی سیکھی۔ اس وقت یہ اپنی عمر کی تیسویں منزل میں تھے۔ گوناگوں ذہنی تغیرات اور اُن کے اثرات کی وجہ سے یہ دور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ عمر کا یہی حصہ وہ نقطہ زندگی ہے جہاں مجاز اور حقیقت ملتے ہیں۔ یہیں سے انکے مزاج اور شاعری میں ایک مفکرانہ اور معلمانہ رنگ پیدا ہوتا ہے جو اُن کی آئندہ متصوفانہ زندگی کا پیش خیمہ ہے۔

شیلدا آنے کے بعد انہیں زندگی کے بہت کچھ تجربات حاصل ہوئے، باوجود
ناز و نعم کے گہوارہ میں پرورش پانیکے غریب اور مفلوک الحال کسانوں کی زندگی سے
متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ہمیشہ زمینداروں اور کاشتکاروں سے سابقہ رہتا
ان کے میل جول اور زندگی کے راست مطالعہ سے ایک نئی اور حقیقی دنیا ان کی
آنکھوں کے سامنے تھی، انہیں مشاہدات اور تجربات کی تصویریں اس دور کے
فسانوں، نظموں اور ڈراموں میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

کاشتکاری اور کاشتکاروں سے ان کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اپنی جاگیر کے
زرعی کاموں میں انہماک اور دلچسپی سے کام لیتے تھے۔ ہندوستان کی اس ۷۲ فیصدی
غریب کاشتکار آبادی کی فلاح کا خیال ان کے دماغ پر مستولی تھا ہمیشہ ایسے
مفید ذرائع پیدا کرنے کی کوشش میں رہتے جن سے کاشتکاروں کی معاشی بیماریوں کا
علاج ہو سکے۔ چنانچہ انھوں نے امداد باہمی کی تحریک سے دیہاتیوں کو روشناس کرایا۔

اس دور کی ادبی کارگذاریاں

افسانے

اس دور کی خاص ادبی کارگذاری ان کے افسانے ہیں جو کئی سال تک مختلف رسائل میں شائع ہوتے
رہے جو مقبول ہو کر دوسرے افسانہ نگاروں پر اثر انداز ہوئے۔ بعض نقاد جنھوں نے اصل کلام کو بنگالی میں دیکھا ہے
بیان کرتے ہیں کہ انکی اعلیٰ ترین صناعی نہ گانوں میں نہ ڈراموں میں بلکہ افسانوں میں ہے۔

ان کے افسانے بہت موثر ہوتے ہیں اور ہر افسانہ حیات انسانی کی کسی نہ کسی
حقیقت کا مظہر ہوتا ہے ان کے افسانوں کو پڑھنے سے قاری کے دل میں ایثار نفس،
ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ قصوں میں پلاٹ ہوتا ہے

۳۔ صحیفہ فطرت کو مذہبی اعتقادات کا بنیادی اصول مانا جائے۔

۴۔ اگرچہ اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد کسی خاص کتاب پر نہ رکھی جائے لیکن ہر الہامی کتاب کی صداقت اور حقانیت کو تسلیم کیا جائے

۵۔ ہر مذہب و ملت کے سچے اصول کو اعتقادی اصول مانا جائے۔

۶۔ ظواہر اور رسوم پر اعتقاد نہ رکھا جائے بلکہ مقصد اصلی صفائی قلب قرار دیا جائے۔

یہ کلکتہ یونیورسٹی کو جڑ بنیاد سے کاٹ کر پھینک دینا چاہتے تھے، اور ایک ایسے مدرسہ کا تخیل ان کے دماغ میں تھا جہاں قومی روایات اور فطرت کے قرب کا توازن قائم رہے۔ اور لڑکوں کی آنکھیں محبت حسن اور خالق کو بے حجاب دیکھ سکیں۔ قدیم ہندستانی طرز پر جنگل میں انھوں نے مدرسہ کی ابتدا کی کیونکہ یہ سمجھتے تھے کہ موجودہ طریقۂ تعلیم لڑکوں کو فطرت کی گوناگوں صنعتوں کے مشاہدے اور خودی کے اظہار کے آزاد موقعے بہم نہیں پہنچاتا شانتی نکیتن کے تحت آئندہ مفصل بحث کی گئی ہے۔

ناول نویسی

۱۹۰۷ء میں ٹیگور نے ناول نویسی کی ابتدا کی "گورا" جو بنگالی مشب سے بڑا ناول تسلیم کیا گیا ہے اسی دور میں لکھا گیا۔ اس میں وہ تمام تفصیل نگاری

موجود ہے جو روسی ناولوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ "گورا" انگریز ماں باپ کا بچہ ہے جو غدر کے زمانہ میں گم ہو جاتا ہے۔ اور ایک بنگالی کی طرح اُس کی پرورش ہوتی ہے۔ جب بڑا ہو جاتا ہے تو انگریزوں سے نفرت کرتا ہے مگر اُس کی منہ بولی ماں اس حقیقت سے آگاہ کرتی ہے کہ اس کے والدین انگریز ہیں۔ اس ناول میں اُس وقت کی ہندو سوسائٹی اور ان کے خیالات کی کامیاب طور پر ترجمانی کی گئی ہے۔ ۱۹۰۲ء ان کے لئے اپنی عمر کا سب سے زیادہ جانکاہ سال ہے۔ اس سال کئی مسلسل موتیں واقع ہوئیں۔ ان کی محبوب بیوی سولہ سال کی رفیقۂ حیات جاتی رہیں۔ یہ ایسا صدمہ تھا کہ یہ تفکرات اور پریشانیوں کا شکار ہو گئے۔ دنیا ان کی نظروں میں تاریک ہو گئی۔ ان پریشانیوں کی تاب نہ لا کر وہ ہمالیہ پر آلمورا چلے گئے۔ اس وقت جبکہ ان کی لاڈلی بیٹی بستر مرگ پر دق سے دم توڑ رہی تھیں، ان کا چھوٹا لڑکا اس وقت بہت کم سن تھا۔ "کتھا" کی اکثر مثنویاں اسی بچہ کے لئے لکھی گئی تھیں۔ "سمارن" کے نام سے حزینہ نظموں کا سلسلہ شروع کیا جو اپنی محبوب بیوی کی یاد میں لکھے گئے تھے، جو بہت ہی درد انگیز ہیں انہیں کی بعض نظمیں (فرٹ گیا ورنگ) کے وسط میں ملیں گی۔

ایک دوسرا ناول "تباہی" (رک) اسی زمانہ میں نکلا، جس میں ہندو خاندان کے تعلقات پر بحث کی گئی ہے کہ انسانی احساسات پر ان کی بنیاد نہیں رہی بلکہ بے معنی بزرگی اور عزت پر۔ ان کی قومی نظموں کا مجموعہ "سودیش سنکلپا" شائع ہوا، جس کا اردو میں ترجمہ "عزم اور آزادی"

ہوسکتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں ان کی موسیقانہ نظموں کا مجموعہ "عبور" (کراسنگ) لکھا گیا۔ اس وقت تک ان کا چھوٹا لڑکا بھی مرچکا تھا۔

علیحدگی بنگال

۱۹۰۵ء

۱۹۰۵ء کا زمانہ بنگال کی سیاسی تاریخ میں بڑا ہی پُرآشوب زمانہ ہے۔ لارڈ کرزن نے اس صوبہ کی دو حصوں میں تقسیم کر دی تھی جس پر بنگالیوں نے آسمان سر پر اُٹھالیا تھا اور ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ رابندرا ناتھ بھی اس آگ میں کُود پڑے۔ اس وقت ہندستان میں کوئی آواز اتنی پُر اثر نہیں تھی جتنی کہ انکی تھی کوئی قلم اتنی طاقت نہ رکھتا تھا جتنا کہ ان کا۔ ٹیگور کی نثر نگاری کا یہ بڑا ہی زرخیز زمانہ ہے۔ اسی سیاسی دار و گیر کے زمانہ میں ٹیگور کی شخصیت بہت چمکی۔ وہ ہندستان کو ایک مرکز پر لانا چاہتے تھے۔ مگر مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے وہ شکستہ خاطر ہوگئے ان کے دماغ نے یکایک پلٹا کھایا۔ اور وہ ایک ہی دن میں تمام سیاسی اداروں اور مجلسوں کو استعفا دے کر "شانتی نکیتان" چلے گئے۔ جتنے مُنھ اتنی باتیں لوگوں نے اس حرکت پر ملامت کی اور ناراضی کا اظہار کیا اور خیال کیا کہ پھر وہی شاعرانہ جنون عود کر آیا ہے۔ مگر یہ وقفہ اور برگشتگی بہت دن تک قائم نہیں رہی۔

یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ وہ دماغی کام سے تھک کر آرام لینے کے لئے

"شانتی نکتان" چلے گئے تھے مگر ایسا بھی نہیں کیونکہ اس کے بعد چھ سال یہ برابر کام میں لگے رہے اور ایک سلسلہ رمزی ڈراموں کا لکھا۔ ۱۹۰۸ء میں عید خزاں، ۱۹۱۰ء میں راجا۔ ۱۹۱۲ء میں ڈاک گھر منصۂ شہود پر آئے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے مذہبی گیت لکھے ۱۹۰۹ء میں گیتان جلی اور دوسری نثری جلدیں نکلیں جو "شانتی نکتان" کے نام سے شائع ہوئیں، اسی عہد کا نتیجہ فکر ہیں۔

دنیا سے اس کنارہ کشی کی وجہ سے ان میں کچھ بیزاری کے آثار پیدا ہوئے۔ جتنا جلد انھوں نے دنیا چھوڑی تھی اتنا ہی جلد وہ واپس بھی ہو گئے۔ وہ کلکتہ آئے اور خود کو آدی برہمو سماج کی تنظیم کے لئے وقف کر دیا جو اُن کے والد کی قائم کردہ ایک انجمن تھی۔

اپنے اثر کے لوگوں کو جمع کیا۔ مگر قدامت پسندوں لنے ایک نہ چلنے دی۔ چند مہینوں کی کوشش اور پروپاگنڈے کے بعد شاعر پھر شانتی نکتان واپس چلا گیا۔

ڈاک گھر

ٹیگور کے ڈراموں میں ڈاک گھر کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے اور یہ دنیا کے مشہور ترین کھیلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ایک رمزی (سمبالک) ڈرامہ ہے۔ جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک لڑکا آمل نامی بیماری کی وجہ سے گھر کی چار دیواری میں مقید ہے

اور بیرونی دنیا کی دلچسپیوں اور مسرتوں سے لطف اندوز ہونے سے مجبور وہ اُمید کا قیدی ہے۔ اور ایک ایسے گمنام گاؤں میں مقیم جس کو شائد ہی کوئی جانتا ہو۔ مگر اُس کی تسکین اور تشفی محض اس ایک خیال سے ہے کہ ملک کا بادشاہ جو اسے خط لکھنے والا ہے۔

لڑکا دریچہ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہر سامنے سے گذرنے والے کو بادشاہ کا قاصد اور پیامبر سمجھتا ہے۔ گاؤں والے گولی۔ دربان۔ پھول والی لڑکی سودھا، گاؤں کا پٹیل، جعفر فقیر سب مزاج پرسی کے لئے لڑکے کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔ آمل ان لوگوں کی گفتگو اور پیشوں سے بڑی دلچسپی لیتا اور راستہ والوں اور دہی بیچنے والے کی آواز کی نقل کرتا ہے۔

"دہی دہی۔ اچھا دہی۔ گاؤں کی دہی سے۔ پنچ منزا ملک سے جو ندی کے کنارے واقع ہے صبح سویرے عورتیں گایوں کو چھاؤں کے نیچے ایک قطار میں کھڑا کرتیں اور دودھ دہتی ہیں۔ اور شام کو دہی جماتی ہیں۔ دہی۔ دہی۔ اچھا دہی۔ اوہو چوکیدار اپنی گذر پر جا رہا ہے۔ چوکیدار۔ اُو چوکیدار، ذرا یہاں آ اور مجھ سے باتیں کرتا جا۔"

چوکیدار آتا ہے اور بچہ کو ڈاک گھر کا پتہ دیتا ہے۔ لڑکے کو اس کا یقین ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ دریچہ میں سے ڈاک گھر پر اُڑتے ہوئے پرچم کو اور لوگوں کی آمد و رفت کو دیکھ چکا ہے۔ چوکیدار لڑکے سے کہتا ہے کہ ضرور ایک نہ ایک دن اس ڈاک گھر سے تمہارے نام ایک خط آئیگا۔ آمل بادشاہ کے خط اور پھول والی لڑکی سدھا کے پھول کے تحفہ کی اُمید میں جو اُس نے واپسی میں دینے کا وعدہ کیا تھا گمن رہتا ہے۔ بادشاہ کا ایک ڈاکٹر ہے جو محض کتابوں کا بندہ ہے بچہ کو کھلی ہوا سے باز رکھنے کی تاکید کی تھی مگر

اب بادشاہ کا ڈاکٹر اور مادھو اس کا سرپرست جو آمل کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ گھر کے تمام در دریچے کھول دئے جاتے ہیں تاکہ بادشاہ کے خط کے آنے میں آسانی ہو۔ بادشاہ کا خط موت کی صورت میں آتا ہے اور آمل کو دنیا کی قید و بند سے ابدی نجات مل جاتی ہے۔

یہ ڈرامہ برلن میں اسٹیج کیا گیا تھا۔ اتفاق سے ٹیگور بھی اس زمانہ میں وہیں تھے۔ خود انھوں نے بھی اپنے ڈرامہ کو مغربی ہاتھوں سے تمثیل کئے جاتے ہوئے دیکھا۔ ڈرامہ ہر حیثیت سے کامیاب تھا مگر اس کی توجیہ اس سے بالکل مختلف تھی جو عموماً ہندستان میں کیجاتی ہے۔ چنانچہ اس فرق کو مار برگ یونیورسٹی کے ڈاکٹر رودلف جو ناظرین میں تھے محسوس کیا اور کہا کہ جرمنی طرز ادا سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا قصہ ہے جو ظاہری حسن سے بھرا ہوا ہے۔ درآنحالیکہ اس کھیل کا باطن بالکل روحانی ہے۔ ڈاکٹر ٹیگور خود اس ڈرامہ سے متعلق لکھتے ہیں "مجھے یاد ہے جن اثرات اور جذبات کے تحت میں نے یہ ڈرامہ لکھا تھا۔ آمل اس شخص کی نمایندگی کرتا ہے جس کی روح کو کھلی شاہ راہ سے پیام ملا ہے اور جو ان قید و بند سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے جس کو باعزت بزرگوں نے اس پر عائد کی ہیں۔ مگر مادھو جو ایک دنیادار ہے لڑکے کی روحانی بے چینی کو خلل دماغ سمجھتا ہے اور اس کا مشیر ڈاکٹر جو رسم و رواج کا پابند، لکیر کا فقیر، اور جس کا کتابوں کے مندرجہ نسخوں پر دارومدار ہے گواہی بھرتا ہے کہ واقعی بچہ کو کسی قسم کی آزادی نہ دیجانی چاہیئے۔ بیمار کو چار دیواری میں بند رکھا جائے، لہٰذا یہ تمام حفاظت کیجاتی ہے۔"

گو دریچہ کے سامنے ڈاک گھر ہے اور آمل ہر وقت منتظر ہے کہ کس وقت

بادشاہ کا خط اُس کے نام آیا ہے جس میں آزادی اور چھٹکارے کا پیام ہے۔ آخرکار بادشاہ کا خاص ڈاکٹر بند دروازہ کھولتا ہے (جو عرف عام میں ملک الموت کہلاتا ہے) اور روحانی آزادی اور بیداری دلاتا ہے۔ اس بیداری میں ایک چیز جو اس کے ساتھ ہے وہ گل محبت ہے جو سدھا نے اُسے دیا تھا۔"

دورِ چہارم

ٹیگور کی عالمگیر شہرت کا راز

سنہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۲۴ء تک

گیتان جلی (نذر نغمہ)

گیتان جلی وہ کتاب ہے جس کی اشاعت سے شاعر کی زندگی اور تصورات نقاط نظر میں زبردست تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ شاعر یورپ جانا چاہ رہا تھا۔ خرابی صحت کی وجہ سے کچھ دن بمبئی میں رک جانا پڑا۔ انہیں دنوں میں انہوں نے اپنی بنگالی نظموں کے مجموعہ (گیتان جلی) کا انگریزی ترجمہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ "میں نے یہ نظمیں صرف اپنے لئے لکھی تھیں۔ لکھتے وقت ان کی اشاعت کا مطلق خیال نہ تھا میری بیوی اور بچوں کی موت کے بعد نہایت ہی کرب کی حالت میں یہ نظمیں لکھی گئی تھیں۔ مگر جب میں نے محسوس کیا کہ دوسروں کی روحانی جراحتوں کا بھی اس سے علاج ہو سکتا ہے۔ تو سب سے پہلے بنگالی میں میں نے شائع کیں۔

جب یورپ پہنچے تو مسٹر ایٹ اگرستانی ملک الشعراء اور دوسرے ہم راز

شاعروں اور ادیبوں سے ملاقات ہوئی۔ شاعر نے مسٹر ایٹ کو گیتان جلی کا ترجمہ دکھایا۔ جس سے وہ بہت متاثر ہوا۔ گیتان جلی کے مقدمہ میں لکھتا ہے ”میں کئی دن تک ان نظموں کے انگریزی نسخہ کو اپنے ساتھ رکھکر ریل گاڑیوں آمنی بسوں کی چھت پر اور ہوٹلوں میں پڑھا کرتا تھا۔ بعض وقت مجھے کتاب اس وجہ سے بند کر دینا پڑتی تھی کہ دوسرے اجنبی کیا خیال کریں گے کہ میں اس سے کتنا متاثر ہوا ہوں“۔

انڈین سوسائٹی لندن نے مسٹر ایٹ کے مقدمہ کے ساتھ اس کتاب کو شائع کیا۔ ہر حلقہ میں اس کتاب کا پر جوش استقبال کیا گیا۔ ابھی بنگالی گیتان جلی کا ایک ایڈیشن بھی ختم نہ ہوا تھا کہ انگریزی کے کئی ایڈیشن نکالنے پڑے۔ اُفق ادب پر ایک اور روشن ستارے کے طلوع ہونے سے رسائل اور اخبارات میں دھوم مچ گئی۔ مشرق کی یہ آواز انگلستان سے گذر کر یورپ، امریکہ اور ساری دنیا میں پھیل گئی۔ اس دوران میں یہ جہاں کہیں گئے ہر جگہ لوگوں نے عقیدت کا اظہار کیا اور ہر مقام پر آنکھیں بچھائی گئیں۔ خیام کے بعد رابندرناتھ ٹیگور ہی کی شاعری ہے جو مغرب میں اتنی مقبول ہوئی۔ جب اغیار نے شاعر کی حقیقی قدر و قیمت سے دنیا کو روشناس کرایا تو خود شاعر کے ہم وطن اس کی عظمت سے پہلی دفعہ واقف ہوئے۔

مسٹر ٹامسن اپنی کتاب میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ نوبل انعام ملنے سے کوئی چھ سال پہلے جامعہ کلکتہ کے نائب امیر جامعہ سر آسوتاس مکرجی نے ایک مرتبہ سینڈیکیٹ میں ٹیگور کو ادبیات کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کی تحریک پیش کی۔ مگر اس مجلس نے اس تحریک کو یہ کہکر ٹھکرا دیا کہ ”ٹیگور تو بنگالی لکھتے ہیں“۔ ایک رکن نے یہ بھی کہا کہ اگر ٹیگور کو ایسی ہی عزت بخشی کا خیال ہو تو انہیں میٹرک لیوشن کا مُمتحن بنا

دیا جاتا ہے۔

نوبل انعام

آخر کار ۱۹۱۳ء میں دنیا نے نوبل انعام دے کر ادبیات کا تاج ان کے سر پر رکھا۔ جامعہ کلکتہ اب خواب سے چونکی اور اسی غلط بنگالی لکھنے والے ٹیگور کی خدمت میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری پیش کرنا فخر سمجھی۔ شاعر نے یہ اعزاز قبول کر لیا۔ ۱۹۱۴ء میں حکومت کی طرف سے سر کا خطاب سرفراز کیا گیا۔ مسٹر ٹامسن لکھتے ہیں کہ جب نوبل انعام کے اعلان کا تار آیا یہ شاعر کے مہمان تھے۔ اس خبر سے پہلی کیفیت جو شاعر پر پیدا ہوئی وہ لرزتی تھی۔ رابندر ناتھ نے کہا "اب میرا امن وسکون جاتا رہا"۔

اب وہ دنیا کے مسلمہ شاعر تھے۔ ان کا کلام دنیا کی ملک بن گیا۔ انگریزی کی وساطت سے دنیا کی ہر مہذب زبان میں گیتان جلی کے ترجمے ہونا شروع ہوئے۔ اور ان کا دوسرا کلام بھی سرعت کے ساتھ دوسری زبانوں میں منتقل ہونے لگا۔ انکے معتقدین اور احباب کا ایک کثیر گروہ انگلستان، جرمنی، فرانس، ہالینڈ اور اسکا نڈی نیویا میں پیدا ہو گیا۔ شائد سب سے بڑھ کر امریکہ کے دل میں زیادہ وقعت پیدا ہوئی۔ ہر مقام پر انہیں لکچروں کے ذریعہ اپنی تعلیمات اور اپنا پیام پیش کرنے کی دعوتیں آنے لگیں۔ ان کی تقریر سننے کے لئے لوگ بیتابی سے انتظار کرتے تھے۔

گیتان جلی کے بعد سے ان کی نظر میں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اور آہستہ آہستہ

قوم پرستانہ ذہنیت کو خیرباد کہہ کر بین الاقوامیت اور اخوت عامہ کی طرف ان کا قدم بڑھتا گیا۔ اب وہ اپنی زندگی کے باطنی توازن کی طرف متوجہ ہو کر اس کے معنی سمجھنے میں مصروف ہو گئے۔ شاعر سے گذر کر فلسفی اور معلم اخلاق کا درجہ حاصل کر لیا مگر یہ بات نظر انداز نہیں کیجا سکتی کہ باوجود فلسفیت کے ان کے کلام کی وہ شاعرانہ خصوصیتیں زائل نہیں ہوئیں جو شعر کی جان ہوتی ہیں۔ نغموں کے سرچشمہ سے نئی نہریں نکلتی ہی رہیں۔

شہرت اپنے انتہائی عروج پر پہنچنے کے بعد کسی قدر کم ہوتی نظر آتی ہے۔ اس پر ان کے ہندستانی معتقدین اور احباب نے کہا کہ یورپ کی مادہ پرست فضا ان کے روحانی کلام سے مستفید ہونے اور اُس سے لطف اندوز ہونے کی اہل نہیں ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ یورپ میں ٹیگور جس قسم کی شاعری سے متعارف ہوئے وہ ان کی متصوفانہ شاعری تھی چونکہ یورپ کیلئے یہ چیز بالکل نئی تھی۔ اس لئے ہر شخص کی زبان پر اسی شاعری کے چرچے تھے اور ان کے اسی مذہبی کلام نے تقدس کا احترام لوگوں کے دلوں میں تھا ٹیگور کے نام کے ساتھ ہی ان کی نورانی وجاہت اور ان کا روحانی کلام پیش نظر ہو جاتا تھا۔

مگر جب گیتانجلی کے بعد ان کے اور کلام کی مانگ بڑھی تو "باغبان" کا ترجمہ پیش کیا گیا جو اُن کے عنفوان شباب کا کلام تھا جس میں ارضی محبت کی وارداتیں اور نسائی حُسن کی سحر آفرینیوں کی داستانیں تھیں۔ جب اس کا ترجمہ مغرب کے ہاتھ میں گیا تو اس کی نظریں جس چیز کی متلاشی تھیں وہ وہاں مفقود تھی' اور یہی ان کی ہر دلعزیزی کی تقلیل کا سبب ہوا جب باغبان کی اشاعت کے بعد ایک خاتون نے پُرجوش الفاظ میں تحسین کا ایک خط شاعر کو لکھا تو شاعر بجائے خوش ہونے کے کسی قدر رنجیدہ خاطر ہو کر کہا "یہ میری ہر تحریر کو تصوف سمجھتی ہیں۔"

انگلستان سے واپسی پر ہندستان میں ان کا پُرتپاک استقبال کیا گیا۔ یہاں آنے کے بعد ان کی نظموں کی دو کتابیں "کرسنٹ مون" (ماہِ نو) اور "بالکا" شائع ہوئیں۔ ۱۹۱۶ء میں ان کا ایک رمزی ڈرامہ "حلقہ بہار" نکلا جسے شانتی نکیتان میں کھیلا گیا۔

سیکل آف اسپرنگ (حلقہ بہار)

"حلقہ بہار" ایک رئیل اور بہاریہ ڈرامہ ہے۔ نوجوانوں کی ایک ٹکڑی ایک بوڑھے کی تلاش میں نکلتی ہے۔ یہ بوڑھا شخص خزاں اور موت کا اور نوجوانوں کا گروہ شباب کا قائم مقام ہے۔ یہ ڈرامہ بھی ٹیگور کے اور رموزی ڈراموں کی طرح اسرار کا حامل ہے۔ راز کا انکشاف اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ ڈرامہ معراج کو نہ پہنچ جائے۔ یہ ڈرامہ بھی شانتی نکیتان کے لڑکیوں اور لڑکوں میں بہت مقبول ہے۔ قابل ذکر یہ بات ہے کہ رابندرا ناتھ ٹیگور نے خود اس میں اندھے شاعر کا کام ادا کیا۔ ان کا ایک مشہور ناول ہوم اینڈ دی ورلڈ (گھر اور دنیا) اسی زمانہ میں لکھا گیا، جس میں جدید سودیشی تحریک کے تمام کارروائیوں کو بتلایا گیا ہے۔ اس ناول کے مطالعہ سے ہند جدید کے رجحانات، قومی احساس اور بیداری کا پتہ چلتا ہے۔

ٹیگور کی شاعری کے دوسرے رُخ

گارڈنر (باغبان)

بعض لوگ جو گیتان جلی کے ذریعہ ٹیگور سے آشنا ہیں جب باغبان کی ورق گردانی کرتے ہیں تو اس مغالطہ میں رہتے ہیں کہ یہ بھی صورت اور معنی کے اعتبار سے گیتان جلی کے مشابہ ہے۔ حالانکہ ان دونوں مجموعوں میں بین فرق ہے۔ ان دونوں میں وہی فرق ہے جو ایک بوڑھے اور جوان میں ہوتا ہے۔ گارڈنر کی نظمیں سونار تاری، مانسی اور چترا سے ماخوذ ہیں اور یہ اس وقت لکھی گئی تھیں جبکہ شاعر جوان تھا۔ اس میں اسی ارضی محبت کی داستانیں ہیں جس سے ہماری شاعری آباد ہے۔ تصوف اور روحانیت کا اس دور میں پتہ نہیں۔ محبت کے ہیجان خیز جذبات اس کلام کا جزو اعظم ہیں۔ اُن جوگی منش غیر مطمئن لوگوں کو جو زندگی کی مثبت مسرتوں سے منہ موڑ کر حقیقت اور معرفت کی لیئے ہیں شاعر یوں کہتا ہے "معاف کرنا۔ میں بھی کبھی جوان تھا۔"

گارڈنر حسن و عشق کی نہایت دلکش اور اصلی تصاویر کا مرقع ہے۔ اور شاعری کے بلند ترین تخیلات حقیقی جذبات اور پر زور محاکات کا بے نظیر مجموعہ۔ گیتان جلی کو اگر ٹیگور کی مناجاتیں کہا جائے تو گارڈنر (باغبان) ٹیگور کی

غزلیں ہیں۔

یوں تو ان کی ہر تصنیف عالم گیر مقبولیت حاصل کرلیتی ہے مگر گارڈنر خصوصیت کیساتھ بہت مقبول ہوئی۔ گارڈنر کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے عربی میں بھی۔ ودیع البستانی نے جو مصر کے مشہور اہل قلم ہیں اس کا ترجمہ کیا۔ اور اپنے نام کی مناسبت سے اس کا نام البستانی رکھا۔

ٹیگور کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان کا کلام زندگی کے مختلف زمانوں کی مختلف کیفیتوں کا مرقع ہے۔ کسی شخص پر بھی ایک حالت اور ایک کیفیت کا رہنا ناممکن ہے، تعلیم و تربیت داخلی اور خارجی اثرات ذات پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ پھر شاعر جو اور لوگوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس کے نقطہ نظر، جذبات وکیفیت اور شاعرانہ تخیلات میں عمر کیساتھ ساتھ تبدیلیاں ہونا ناگزیر ہے۔ یہی ایک پیدائشی شاعر کی اولین شناخت ہے کہ آیا اس کا کلام اس کی زندگی سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ٹیگور کے شعری اور نثری کارنامے اس کے شاہد ہیں کہ یہ جب تک جوان تھے اس زمانہ کی شاعری، ڈراموں اور دوسرے ادبی کارناموں میں جذبات وخیالات کی وہی شدت ہے اور محبت کی پرستاری میں وہی والہانہ غلو اور طبیعت میں وہی لاابالی پن ہے جو ایک نوجوان عاشق میں ہونا ضروری ہے۔ کہیں انہیں رادھا کرشنا کی آسمانی محبت کے پردے میں اپنی ذات کو بے نقاب کرتے ہیں، اور کہیں بلاواسطہ اپنے واردات وکیفیات قلب کی ترجمانی اور بے حجابانہ حسن وعشق کے اسرار کی پردہ دری کرتے نظر آتے ہیں۔

ان کی نوجوانی کے دور شاعری میں پیغام کی تلاش کرنا بے سود ہے۔ وہ اس وقت معلم اخلاق نہیں بلکہ صرف عاشق تھے۔ بوڑھے نہیں بلکہ جوان تھے فلسفی نہیں بلکہ آرٹسٹ تھے۔ جیسے موسم بہار میں پھول کھلنے کا کوئی مقصد نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ یہ اس کی شگفتگی کا موسم ہے، یا جیسے کوئی خوش نوا پرند کسی غرض کے لئے نہیں گاتا بلکہ یہ اس کی مستور مسرتوں کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے بالکل ایسے ہی ٹیگور کی جوانی کے نغمات کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ایک عاشق کی روح کو جس میں جوانی کی ترنگیں ہیں ایسا کرنا چاہیئے تھا۔

یوں تو ان کی کل شاعری میں چاہے وہ کسی دور کی ہو بڑا حصہ موسیقی کا ہے، جو پڑھنے والوں پر وجد طاری کرتا ہے۔ مگر خصوصیت کے ساتھ دور شباب کی شاعری میں اس جزو کا حصہ نمایاں ہے، اور پھر سادگی اور سلاست کلام کو مقبول بنانے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے گیت پورے بنگال میں گائے جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ نوجوان سے لے کر گلی کوچوں کے لڑکے اور جنگل کے چرواہے تک گاتے پھرتے ہیں۔ ذیل کے واقعہ سے ان کی مقبولیت کا پتہ چلتا ہے ارنسٹ وائز اپنی کتاب بیوگرافیکل اسٹڈی آف ٹیگور (حیات ٹیگور) میں لکھتے ہیں کہ ایک موقع پر لندن میں مسٹر مانٹیگو نائب وزیر ہند نے بیان کیا کہ وہ ایک مرتبہ ہندستان کے کسی جنگل میں رات کے وقت گھوڑے پر سوار گذر رہے تھے۔ ایک مقام پر دیکھا کہ دو تین آدمی آگ کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ مانٹیگو راستہ دریافت کرنے اور اپنے تھکے ہوئے گھوڑے کو آرام پہنچانے کے خیال سے اُتر پڑے، ان لوگوں کے پاس آئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک غریب اور خستہ حال چرواہا لڑکا جنگل سے نکل کر آیا، اور آگ کے

پاس بیٹھ گیا۔ اول ایک آدمی نے گانا شروع کیا پھر دوسرے نے گایا۔ اس کے بعد لڑکے کی باری آئی۔ اور اس نے ایک گیت گایا جو الفاظ و موسیقی کے اعتبار سے پہلے گیتوں سے زیادہ دلکش تھا۔ لڑکے سے پوچھا کہ یہ گیت کس کا ہے تو اس نے کہا مجھے معلوم نہیں لوگ ہر جگہ ان گیتوں کو گاتے ہیں۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد مسٹر مانٹیگو نے وہی گیت کسی دوسرے دور کے مقام پر گاتے سنا۔ پوچھا یہ گیت کس کا ہے، تو لوگوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کا نام لیا۔ مانٹیگو نے اس سے پہلے ٹیگور کا حام بھی نہ سنا تھا۔

دوسرا واقعہ سی، ایف انڈریوز کا ہے، وہ بیان کرتے ہیں میں وسط ہمالہ کے ایک گاؤں میں مقیم تھا جو شاعر (ٹیگور) کے وطن سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ لندن سے قسطنطنیہ۔ شام کے وقت لوگ گیت گا رہے تھے ایک چھوٹے سے لڑکے نے جس کی عمر بارہ برس کی ہوگی ٹیگور کی ایک نظم گائی جس کا مضمون مادر وطن تھا۔ نظم کی زبان پہاڑیوں کے لئے ناقابل فہم تھی۔ لیکن الفاظ کی روانی، اور چھوٹے گانے والے کا جذبہ خفی خود معنی خیز اور پُر اثر تھا۔ سُننے والے اس طرح جھوم رہے تھے کہ گویا کسی نے جادو کر دیا ہے۔ ہندستان میں ٹیگور کی موسیقی اور شاعری کے اثر و قوت کا یہ عالم ہے۔"

"نامۂ محبت ایک ایسے شخص کے پاس جائے جو پڑھنا نہیں جانتا تو کچھ پرواہ نہیں صاف الفاظ محبت کے لئے قفل اور کنجی نہیں ہے غیر مقروء خط اس کے (عورت) خیالوں کو گیتوں میں تبدیل کر دیتا ہے" (فرٹ گیا ورنگ)

ان کی اس دور کی شاعری بانسری کا ایک میٹھا راگ ہے جو سُننے والوں پر

بیہوشی طاری کرتا ہے۔ ان کا قلم ایک مضراب ہے جو ہر جنبش سے نغموں کا طوفان پیدا کرتا ہے۔

"کیا میری ٹھوکر سے زمین رباب کے ستاروں کے مانند نغموں سے کپکپا جاتی ہے۔ کیا یہ صحیح ہے کہ جب میں دکھائی دیتا ہوں تو رات کی آنکھ سے شبنم کے قطرے گرتے ہیں، اور صبح مجھے اپنی روشنی میں لپیٹ لینے سے خوش ہوتی ہے۔" (گارڈنر)۔

ٹیگور محبت کی ہر کیفیت سے واقف ہیں۔ ان کی گیتوں میں شرمیلاپن اور انفعالیت ہے، ان کا کلام یکسر موسیقی ہے، یہ خود اچھے ماہر موسیقی اور خوش آواز مغنی ہیں۔ بچپن میں ان کے والد ان سے گانا سنا کرتے تھے۔ جن لوگوں نے انھیں اپنی نظمیں پڑھتے سنا ہے وہ واقف ہیں کہ باوجود پیرانہ سالی کے آواز کی شعریت باقی ہے۔ اتنا درد اور اثر ہے کہ ایک اجنبی بھی جو شاعر کی زبان سے ناواقف ہے اُن کی گیتوں کی موسیقی اور طرز قرات کی دل آویزی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

موسیقی کی دو قسمیں ہیں، ایک تو فنی دوسرے غیر فنی۔ یہاں غیر فنی سے مُراد وہ موسیقی ہے جس میں چکی کے گیت، بچوں کی لوریاں۔ پنگھٹ کے گیت، کشتی بانوں کے گیت۔ فقیروں کے گیت شامل ہیں۔ ٹیگور کی نظموں اور ڈراموں میں فنی موسیقی سے زیادہ غیر فنی موسیقی کا عنصر غالب ہے، اور یہی وجہ ان کی عام مقبولیت کی ہے۔ خواص سے لیکر عوام تک، عالم سے لیکر جاہل چرواہے، کشتی بان، بنڈی بان، کاشتکار تک ان کے گیتوں کو گاتے اور لطف اٹھاتے ہیں۔

پھر زبان کی سادگی، لطیف تشبیہ اور استعارے، جذبات کی رنگینی کلام میں جوش پیدا کرتی ہے، اور جو چیز شاعر کے ذہن اور تخیل میں موجود تھی وہ سُننے والے کے دل میں تیر کی طرح اُتر جاتی ہے۔

کرسنٹ مون (ماہِ نو)

نظموں کا یہ مجموعہ اپنی جدت موضوع اور وسعت خیال کے اعتبار سے بالکل نئی اور نہایت عجیب شئے ہے۔ طریق وسلوک، فنا فی الذات، وحدت الوجود، رضا وتسلیم کے مضامین گیتان جلی کا موضوع ہیں اور ہر زبان میں ایسے خیالات کا کافی ذخیرہ موجود ہے، اسلامی صوفیوں اور شاعروں نے روحانی مشاہدات، وجدانی انکشافات اور قلبی انبساط کو ایسے دلکش پُر کیف اور لبریز محبت انداز میں بیان کیا ہے کہ ٹیگور کی نذر نغمہ (گیتان جلی) کی کوئی خاص وقعت باقی نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو داں طبقہ میں ٹیگور کی گیتان جلی اتنی مقبول نہیں ہوئی جیسی کہ یورپ اور امریکہ میں ہوئی۔ لیکن کرسنٹ مون (ہلال) کے موضوع پر کسی زبانہ میں کوئی مستقل تصنیف نظر نہیں آتی۔ ان نظموں میں بچے کو مختلف حیثیتوں سے پیش کیا گیا ہے۔ اور دکھایا گیا ہے کہ بچہ کا اثر ہماری زندگی، ہماری معاشرت، ہمارے خیالات وجذبات پر کیا پڑتا ہے۔ بچہ ہر شخص کو ہر ملک میں پیارا ہے۔ اس کی بھولی صورت، پیاری باتیں

معصومانہ انداز سب کو پسند ہیں۔ ہر زمانے کی شاعری میں اس ارتقی کے متعلق خیالات ظاہر کئے گئے ہیں۔ عربی میں بچوں کے مرثیے، فارسی اور اردو مثنویوں میں ہیرو اور ہیروئن کا بچپن۔ مراثی انیس میں اطفال اہل بیت کا ذکر، سنسکرت اور ہندی میں نامور اور بہادر ہندوؤں کے حالات طفلی بہت دلکش اور لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن کسی زمانے میں ان مضامین کو مستقل تصنیف کی حیثیت نہیں دی گئی۔ اور اس جامعیت اور وسعت نظر کے ساتھ کسی نے نہیں لکھا۔ یہ صرف "ہلال" کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ "وڈسورتھ" اور "بلیک" "لانگ فیلو" کی مشہور نظمیں جدت اور نزاکت اپنے اندر رکھتی ہیں۔ فلسفہ طفلی اور بلند و جدید اسلوب بیان کی وجہ سے ان عنوان کے تحت آتی ہیں مگر اس موضوع پر آخری مہر ثبت کرنے والے ٹیگور ہی ہیں۔

کرسنٹ مون "ہلال" میں ٹیگور نے بتایا ہے کہ بچے کی روح کو خدا کی ذات سے کیا تعلق ہے اور وہ انوار الٰہی سے کیونکر براہ راست مستفیض ہوتا ہے۔ اور کس طرح اس نور کی ضوفشانی دنیا و اہل دنیا پر کرتا ہے۔ بچہ دنیا کے لئے نہ صرف حسین ترین آرائش ہے بلکہ دنیا کے محاسن اخلاق بھی بچہ ہی کی ذات سے وابستہ ہیں۔ بچہ ہمارے دلوں میں رقیق جذبات اور بلند خیالات پیدا کرتا ہے۔ ہمارے اعمال و مقاصد میں استقلال، محبت و ایثار کی روح پھونکتا ہے۔ ہمارے ان تعلقات کو جو خدا کے ساتھ ہیں قوی کر دیتا ہے۔ یہ مضامین جس انداز میں بیان کئے گئے ہیں وہ ٹیگور اور صرف ٹیگور کا حصہ ہیں۔ صرف یہی نظمیں ٹیگور کو غیر فانی بنانے کے لئے کافی تھیں۔

ٹیگور کی تعلیم کے مآخذ

کسی شخص کی عظمت کی یہی ایک نشانی نہیں ہے کہ ہر جگہ اُسی کے چرچے ہوں بلکہ یہ بھی کہ اُس سے متعلق لوگوں میں کچھ غلط فہمی پیدا ہو جائے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے متعلق بھی دو متضاد رائیں ہیں، ایک تو وہ طبقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ٹیگور کے پاس کیا ہے، وہی پرانے خیالات جو صدیوں سے ہمارے شعراء دُہراتے چلے آ رہے ہیں جن کو بار بار سُنتے سُنتے طبیعت میں بیزاری پیدا ہو گئی ہے۔ بعض بزرگ اس خیال کے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ٹیگور کا فلسفہ حیات اور اُن کی تعلیمات عیسائیت کی خوشہ چینی ہے، اور دوسرے ہم عصر ہندوستانیوں کی طرح ٹیگور نے بھی مغربی تعلیمات اور عیسائی خیالات کو اپنے میں ایسا سمو لیا ہے کہ وہ بالکل اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ بقول "سیکنیٹر" اگر ٹیگور مغرب کے اس احسان کو قبول نہیں کرتے ہیں تو یہ ان کا تقاضائے حب وطن "ناشکری اور بے خلوصی ہے" ٹیگور نے "اپنی ذہانت اور ادبی قابلیت سے یورپ کی اخلاقیات کو ہندستانی جامہ پہنایا ہے" ایک پادری صاحب نے یہ بھی کہا کہ گیتانجلی کا خدا ہندو خدا نہیں بلکہ عیسائی خدا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو وید اور قدیم ہندو فلسفہ کو ٹیگور کی تعلیمات کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ رابندر ناتھ ٹیگور نے قدیم فلسفہ پر موجودہ ضرورتوں کے مطابق جدید رنگ چڑھا کر اپنا فلسفہ پیش کیا ہے۔ ان کا سارا کلام دراصل اپنشد اور وید کی تعلیمات کی تفسیر ہے۔ خود شاعر بھی موخرالذکر خیال کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ وہ

سدھنا میں اقرار کرتے ہیں کہ "وید، اپنشدھ اور گوتم کی تعلیمات ہمیشہ میرے لئے بصیرت افروز چیزیں رہی ہیں، میں نے ان خزانوں سے، اپنی زندگی اور اپنی تعلیمات میں استفادہ کیا ہے۔" دراصل رابندرناتھ ٹیگور کے کلام کا محور وہی نظریہ وحدت الوجود ہے جو تمام ہندو فلسفہ کا نچوڑ ہے۔

سدھنا میں انھوں نے وجود باری انسان اور حیات کے دوسرے مسائل پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ مفصل بحث کی ہے، پھر بھی ہم اس کتاب کو مابعد الطبیعات کا کوئی اصولی مقالہ نہیں کہہ سکتے بلکہ صرف شاعر کے دل کی آہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان کی تعلیمات کی تلاش خطبات سے زیادہ گیتان جلی میں کیجائے کیونکہ شاعری ہی کسی شخص کی تحت شعوری دلی کیفیات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ گو شاعری فلسفہ نہیں مگر ان کے کلام میں جو یکسر ذات باری کی تجلیات اور اُن لطیف جذبات کا آئینہ دار ہے جو روحانی مراقبوں میں کشف کی صورت میں روح پر طاری ہوتے رہیں، ہم اُن کے فلسفہ یا پیام کی تلاش کر سکتے ہیں۔

غور کے بعد ایک شخص اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ٹیگور اپنے رباب سے وہی سرمدی نغمے نکال رہے ہیں جو ہم رومی کی نے سے سُن چکے ہیں، یا جس کو کبیر جیسے صوفی شعرا نے الاپا ہے، ان کا کلام پڑھنے کے بعد ہم محسوس کرتے ہیں کہ "آواز آرہی ہے یہ کب کی سُنی ہوئی" فرق صرف یہ ہے کہ نغمہ وہی ہے مگر ساز بدلا ہوا ہے، مئے وہی ہے مگر مینا دوسری ہے۔

انسانی شعور ہی تمام تفتیش اور تجسس کی بنیاد ہے، انسانی زندگی کی متضاد ہستی ہی دراصل صداقت کی کھوج پر انسان کو آمادہ کرتی ہے، ٹیگور خودی میں اپنے وجود

اور فطرت دونوں کو شامل کرتے ہیں، وہ روحِ اعظم میں ملے ہوئے بھی ہیں اور اُس سے الگ بھی:۔

"اپنے وجود کے ایک کنارے پر میں کنکروں اور پتھروں میں سے ایک ہوں اور وجود کے دوسرے کنارے پر میں ان سب سے الگ بھی ہوں"۔

ماسوا کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے انسان نوامیس الٰہیہ اور قوانین قدرت کا مطیع ہے لیکن بالذات "انا" قطعاً آزاد ہے۔ انسان ایک ایسا محدود وجود ہے جس میں لامحدودیت ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ گیتان جلی کا پہلا شعر ہی زندگی کی ابدیت اور خالق و مخلوق کے تعلق کو ظاہر کرتا ہے، اور یہی ان کے پیغام کا لب لباب اور مذہبی شاعری کا نچوڑ ہے۔

"تو نے مجھے غیر متناہی بنا دیا۔ ایسی ہی تیری مرضی ہے، اس کمزور ظرف (ہستی) کو بار بار خالی کرتا ہے اور ہمیشہ ایک تازہ زندگی سے اسے معمور کر دیتا ہے"۔

ٹیگور موت کو کتابِ زندگی کا خاتمہ نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ ان کے نزدیک موت زندگی کا زرین تاج ہے، مکمل زندگی کے لئے ایک خوشگوار اقدام، حیاتِ جاویدانی کا راستہ، موت دراصل حیاتِ دنیوی اور حیاتِ ابدی کے درمیان ایک منزل ہے۔ جب دنیا میں انسان آیا تھا تو کوئی اجنبی نہیں تھا بلکہ اُس نے خود کو اپنی ماں کی آغوش ہی میں پایا، اسی طرح بعد الموت ماں کی آغوش کی گرمی اور اُس کا سکون غائب نہیں ہو جائیگا۔ چنانچہ وہ گیتان جلی میں بڑی خوبی سے زندگی اور معاد کے مسئلہ کو حل فرماتے ہیں:۔

"میں اُس لمحہ سے واقف نہیں تھا جب اول اول میں اس زندگی کے راستے

گذر رہا۔

وہ قوت کیا تھی جس نے مجھے اس وسیع رازگاہ میں اس طرح کھلا دیا
جس طرح آدھی رات کو جنگل میں کوئی کلی کھلے۔

صبح کو میں نے روشنی پر نظر ڈالی، میں نے محسوس کیا کہ میں اس دنیا میں اجنبی نہیں ہوں
اور یہ کہ بلا صورت و نام کی ایک ناقابل فہم شئے نے خود میری ماں کی صورت میں
مجھے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ اسی طرح موت کی حالت میں بھی وہی غیر معلوم
شئے اسی طرح نمودار ہوگی جس طرح ہمیشہ میں نے اُسے جانا ہے، اور چونکہ میں
اس زندگی سے الفت کرتا ہوں اس لئے میں جانتا ہوں کہ اسی طرح
موت سے بھی الفت کروں گا۔ جب ماں اپنی داہنی چھاتی سے بچہ کو جدا
کرتی ہے وہ چیخنے لگتا ہے، لیکن فوراً ہی بائیں چھاتی میں اپنی تسکین پاتا ہے۔"

ٹیگور کی شاعری تمام تر تصوف کے نازک ترین مسائل پر مبنی ہے، رضا و تسلیم کے مرقعوں سے ان کا سارا کلام بھرا پڑا ہے۔ تصوف کی تعریف اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، تصوف وجدانی کیفیات، اور باطنی مشاہدات کا دوسرا نام ہے جس کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا، روح کے لطیف تجربات کو الفاظ احاطہ نہیں کر سکتے، "کان را کہ خبر شد خبرش باز نیامد" چنانچہ ٹیگور خود اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:۔

"میں لوگوں میں فخر کیا کرتا تھا کہ میں نے تجھے جان لیا ہے، میری تصانیف میں
لوگ تیری تصویر کو دیکھتے ہیں، وہ آتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں "وہ کون ہے؟"
مجھے نہیں معلوم انہیں کیا جواب دوں، میں کہتا ہوں کہ فی الحقیقت میں کچھ نہیں

کہہ سکتا"۔ وہ مجھ پر الزام رکھتے ہیں اور نفرت کے ساتھ چلے جاتے ہیں اور تو وہیں بیٹھا مسکراتا ہے۔

میں تیرے فسانے اپنے غیر فانی نغموں میں سنایا کرتا ہوں، راز دل بے اختیار عیاں ہو جاتا ہے، وہ آتے ہیں اور مجھ سے پوچھتے ہیں "بتا ان سے تیرا کیا مطلب ہے؟" میں نہیں جانتا انہیں کیا جواب دوں، میں کہتا ہوں" آہ کون جانتا ہے، ان کا کیا مطلب ہے"۔ وہ مسکراتے ہیں اور نمایاں نفرت کے ساتھ چلے جاتے ہیں اور تو وہیں بیٹھا ہوا مسکراتا ہے"۔

مشرق بعید کا سفر

یہ زمانہ جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ کچھ تو انسانی زندگی کی ارزانی، اور انسانیت کی غارتگری اور کچھ خانگی زندگی کی ناخوشگواری کی وجہ سے شاعر کا دل رنج والم سے بھرا ہوا تھا۔ اُن کی روح بے چین تھی، اس کرب کی حالت کو توڑنے کے لئے وہ ہمالہ پر چلے گئے، شائد وہاں فطرت ان کی دلداری کرسکے مگر وہاں بھی کچھ نہ ہوا۔ دماغی پستی برابر جاری رہی۔ آخر کار وہ پھر آشرم واپس آگئے۔ مدرسہ کی پوری ذمہ داریوں کو اپنے سر لے کر پورے جوش اور استقامت کے ساتھ ہمتک ہو گئے مگر انسانیت کی تباہی کا منظر اور اس کے علاج کا سوال ہمیشہ پیش نظر رہتا تھا۔ مشرق و مغرب کے سمجھوتے اور ملاپ کی تدابیر میں ان کا دماغ لگا ہوا تھا۔ تمام

لمحات اسی فکر میں گذرے کہ کس طرح اس خونخوار جنگ کے درندے پر غلبہ حاصل کیا جائے۔

جنگ سے پہلے ہی انہیں خون کی بو آ رہی تھی۔ اور انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ امن کی بساط الٹنے والی ہے۔ چنانچہ جنگ عظیم کی خبر سننے سے بہت پہلے انھوں نے اپنی ایک نظم "تباہ کار" میں اس خوف کا اظہار کیا ہے:۔

"کیا یہ تباہ کار ہے جو آ رہا ہے؟

کیونکہ آنسوؤں کا تلاطم خیز سمندر زخم کے مدوجزر میں چھپا ہوا نظر آ رہا ہے۔

فضا میں سرخ بادل برق کے کوڑے سے مار کھا کر جاگتے نظر آ رہے ہیں۔

جنوں کے رعد مثال قہقہوں سے آسمان بھرا ہوا نظر آ رہا ہے۔

موت کے بنائے ہوئے رتھ میں زندگی بیٹھی ہوئی ہے۔ تو اس کے حضور میں وہ تمام پیش کر جو تو رکھتا ہے"۔

ایک زمانہ سے یہ مشرق بعید کے سفر کے عزائم دل میں پکا رہے تھے۔ ان کے والد مہارشی نے نصف صدی پیشتر انہیں ممالک کا سفر کیا تھا۔ یہ بھی چاہتے تھے کہ اپنی تعلیمات اور اپنے عالمگیر برادری کے پیغام کو مشرق بعید کے بھی گوش گذار کر دیں۔ اور ان کی دلی خواہش یہ تھی کہ مہارشی کی یادگار آشرم کو وسعت دیجائے اور یہ اس دن کے متمنی تھے جبکہ شانتی نکتان مدرسہ کی حالت سے گذر کر عالمگیر برادری کا مرکز بن جائے۔ جہاں مشرق و مغرب کے متعلمین اور معلمین کی مساوی طور پر عزت اور اکرام کیا جائے۔

انہیں حالات کے تحت انھوں نے ۱۹۱۵ء میں مشرق بعید کے سفر کا

مصمم ارادہ کر لیا۔ تاکہ چین اور جاپان کے ممتاز مفکرین سے اشتراک عمل اور دوستی پیدا کی جائے۔ یہ اگست میں اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہتے تھے چنانچہ ایک جاپانی جہاز میں نشستیں بھی محفوظ کرالیں مگر چند ایسی ناگزیر رکاوٹیں پیدا ہوئیں کہ سفر ملتوی کرنا پڑا۔

آخر کار ۱۹۱۴ء میں شاعر کی یہ دیرینہ آرزو پورا ہونیکا وقت آگیا اور وہ پیرسن، مو کل ڈے آرٹسٹ اور آنڈریوز کو اپنے ساتھ لے کر جاپان اور چین کے ارادے سے کلکتہ سے روانہ ہوئے۔

سمندر کا موسم اچھا نہیں تھا۔ ان کا جہاز خلیج بنگالہ کی طوفانی دقتوں سے گذرتا ہوا چین پہنچا چین میں ان کا قیام زیادہ دن نہیں رہا کیونکہ جاپان کے لوگ بے صبری سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ جب یہ جاپان گئے تو جاپانیوں نے ان کا نہایت ہی پُر جوش استقبال کیا۔ گویا کہ شاعر ایشیا کے لئے اعزاز اور مرتبہ ساتھ لایا ہے۔ مگر جب شاعر نے عسکری شہنشاہیت کے خلاف جو اُس وقت جاپان کے رگ وریشہ میں پھیلی ہوئی تھی یہ بانگ دہل پوری قوت کے ساتھ تقریریں کیں اور مشرق و مغرب کے ملاپ اور عالمگیر برادری اور ہمدردی کا ترانہ الاپا تو چو طرف سے یہ آوازیں سنائی دینے لگیں "ہندستانی شاعر ایک شکست خوردہ قوم کی نمایندگی کر رہا ہے"۔ اس لئے جس جوش اور سرگرمی کا مظاہرہ کیا گیا تھا اتنی ہی سرد مہری برتی گئی۔ چین مقاصد کی تکمیل کی اُمیدیں اپنے ساتھ لائے تھے وہ خاطر خواہ پوری ہو سکیں۔ یہی وقت تھا جبکہ شاعر نے اپنی مشہور نظم "شکست خوردہ کا گیت" لکھی جو اس طرح شروع ہوتی ہے۔

"جب میں رہ گذر پر کھڑی رہتی ہوں، تو میرا مالک مجھسے شکست کا گیت گانے کی فرمائش

کرتا ہے کیونکہ یہ گیت ایک دلہن ہے جس سے وہ محو اختلاط رہتا ہے۔"

موسم بہار کے یہ مہینے جبکہ جاپان پر عسکریت کا بخار چڑھا ہوا تھا نہایت ہی مایوسی میں گذرے۔ وہ دماغی الجھن آغاز جنگ کے وقت جس کا یہ شکار ہوئے تھے پھر عود کر آئی۔ اسوقت شاعر کی روح موجودہ زمانہ کی تباہ کن اور خونخوار ذہنیت کے خلاف آمادہ پیکار تھی۔ شاعر نے اپنے منطبات موسوم "بہ قومیت" میں دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی ابواب جاپان ہی میں نہایت اشتعالی کیفیت میں لکھے گئے۔ اور وہیں پڑھے بھی گئے۔ بعد کو یورپ میں ان کی اشاعت ہوئی اور سوئٹزرلینڈ میں رومین رولینڈ نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

یہاں یہ بات بیان کر دینا ضروری ہے کہ جب شاعر نے جنگ کے بعد دوبارہ ۱۹۲۴ء میں چین و جاپان کا سفر کیا تو حالات بدل چکے تھے۔ دنیا کے سر سے جنگ کا بھوت اتر چکا تھا۔ جب وہاں کے لوگوں نے ان کے پیام کو سمجھا اور سر آنکھوں پر رکھا۔

۱۹۱۶ء میں یہ امریکہ گئے جہاں یہ بہت مشغول رہے۔ بہت دوست پیدا ہوئے ہر جگہ دل کھول کر نہایت خلوص سے آؤ بھگت کیگئی۔ اس سفر کا ایک واقعہ نہایت دلچسپ ہے جس سے انکی شخصیت کے اثر کا پتہ چلتا ہے یہ ریاست متحدہ امریکہ کے ایک مقام پر جا رہے تھے۔ انکے دیکھنے کیلئے شہر والے بے چین تھے۔ عورتیں اور مرد بڑھ بڑھ کر انکا درشن کرنا چاہتے تھے۔ ایک بیوہ عورت نے اپنے اکلوتے لڑکے کو جب یہ قریب سے گذرے قدموں پر ڈالدیا۔ جسکو انھوں نے اٹھاکر پیار کیا۔ اس پر چھوٹے لڑکے نے کہا "کیا آپ عیسیٰ مسیح ہیں؟" ٹیگور نے کچھ جواب نہ دیا صرف مسکرا دیے انکے معتمد نے کہا عیسیٰ مسیح نہیں مگر انکے مانند ہیں۔"

ان کے خیال میں یہاں کا سفر اطمینان بخش اور کامیاب رہا۔ امریکہ میں بیمار پڑ گئے وطن کی یاد ستانے لگی اور یہ ہندوستان واپس ہو گئے۔

دورِ پنجم

ٹیگور کا پیام

۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۵ء تک

یہ کہنا غلط ہے کہ رابندرا ناتھ مغربی برکات سے بالکل چشم پوشی کرتے اور مشرق ہی کو جا و بے جا سراہتے ہیں۔ نیکی اور صداقت سے بغل گیر ہونے کے لئے ان کے بازو ہمیشہ پھیلے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ مشرق کی طرف سے ہو یا مغرب کی طرف سے۔ ان کا مقولہ ہے "انسان کی تمام اعلیٰ ترین کارگذاریاں اور اس کی عظیم ترین شوکتیں۔ مجھے اجازت دو کہ میں انھیں اپنی کہوں"۔ وہ مغرب کی آزادی، تنظیم اور اُس معاشرتی خدمت کی اسپرٹ کے جو سارے مغرب میں پھیلی ہوئی ہے دل سے ثنا خواں ہیں۔ "توپوں کے دھوئیں اور بازاروں کی گرد میں سے اُس کی دیو رپ کی ! اخلاقی روشنی چمک رہی ہے جس کی بنیادیں سماجی معتقدات سے ہٹے کر بہت ہی عالمگیر ہیں۔" (قومیت)۔

"یورپ نے ہمیں عوام کی بہبود کے اصول اور رفقانون کا احترام سکھایا۔ جس کی وجہ سے معاشرہ میں ربط اور آزادی برقرار رہتی ہے۔ سب سے بڑھ کر

یورپ نے اپنے صدیوں کی قربانی اور شہادتوں کے بعد ہمارے آگے حریت کا علم بلند کیا۔ حریت شعور۔ حریت خیال اور عمل آرٹ اور ادب ہیں۔" (قومیت)۔

ٹیگور اس احسان کو نہیں بھولتے جو یورپ نے اپنے تصورات اور تعلیمات سے مشرق کو مستفید کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اُس کے دوسرے رُخ کو بھی نظرانداز نہیں کرتے۔

مغرب کا تمدن

مغربی تمدن کی بنیادیں افادیت پر کھڑی ہوئی ہیں وہ بجائے روحانی کے میکانکی اور بجائے مذہبی کے معاشرتی اور بجائے امن کا مبلغ ہونیکے قوت کا پرستار ہے۔ وہ مسابقت کی قربان گاہ پر روحانیت کی بھینٹ چڑھاکر قوت حاصل کر رہا ہے۔ وہ فطرت سے برسرپیکار ہے۔" اپنے ماحول پر غلبہ پانے کے لئے انسان اپنی پوری قوتیں تلاش کے راستہ پر صرف کر رہا ہے۔ وہ امغرب ہمیشہ خود کو منظم بنا رہا ہے تاکہ فطرت اور دوسری نسلوں سے جنگ کرے۔ اس کے ہتیار روز بروز بڑھتے جارہے ہیں، اُس کی مشینیں، آلات حرب، تنظیمیں روزافزوں ترقی پر ہیں۔" برخلاف اس کے وہ کہتے ہیں کہ ہندستان قدیم کی تہذیب کچھ دوسرا ہی زاویہ نگاہ رکھتی تھی جس میں کائنات کا ہر ذرہ داخل تھا۔ خدا کی مخلوق کو اپنے وجود سے علحدہ تصور نہ کیا جاتا تھا! انسانی آزادی

اور اکملیت کا حصول مغربی عقیدے کے خلاف جنگ، استدلال اور قوت کے ذریعہ نہیں بلکہ محبت کے ذریعہ ہوتا تھا۔

ٹیگور جذبۂ وطنیت کے خلاف نہیں مگر یورپ کے اُس انسانیت سوز تخیل قومی کو ضرور بری نگاہ سے دیکھتے ہیں جس کا نتیجہ جنگ عظیم تھا اور نہ معلوم ایسی کتنی جنگیں ہونگی جہاں مغرب کا اُستاد قومیت کے جنون میں یہ چلاتا ہے۔ صُرف ملک سے محبت رکھنا کافی نہیں۔ پورے طور پر مسلح ہو کر محبت کرو۔ ہر اُس وجود سے نفرت کرو جو وہ (اپنا ملک) نہیں ہے۔ نفرت مقدس اور قابل احترام ہے"۔ گیتان جلی کے محب وطن کی آواز اس سے کس قدر مختلف ہے وہ کہتا ہے "جہاں دماغ خوف سے خالی اور ربلند سر ہے۔ جہاں دنیا تاریک دیواروں سے ٹکرا کر پاش پاش نہ ہوئی ہو۔ جہاں دماغ وسیع نیت اور عمل کے ساتھ بڑھ رہا ہو۔ اے مالک آزادی کے آسمانوں میں میرے ملک کو بیدار کر"۔ اسی کے دوش بدوش ان کے دوسرے گیت "غمگین عورت" کو بھی پڑھئے جہاں وہ تخریبی یلغار سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ "میں اُسے فتح کی رتھ میں بٹھا کر ارض کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پھرایا۔ مفتوح دل اس کے قدموں پر گر پڑے۔ نعرہ تحسین سے آسمان ہل گیا۔ اُس کی آنکھیں افتخار کی روشنی سے کچھ دیر کے لئے چمک اُٹھیں پھر کچھ دیر بعد آنسوں سے دھندلی پڑ گئیں غم زدہ عورت پکار اٹھی مجھے اس فتح میں کوئی خوشی نہیں"۔

جنگ عظیم اور دوسری یورپی جنگوں کی خونی داستان شاعر کے پیش نظر ہے جس سے اس کا دل دکھتا ہے اور اس عقیدہ کا کامل یقین ہوتا ہے کہ یورپ نے

روحانیت کو بالکل تباہ کر ڈالا۔ انسانی زندگی کے اس ناقابل تلافی نقصان عظیم کی وجہ سے دل غصہ سے بھرا ہوا ہے اور بے ساختہ اُس کی زبان سے یہ الفاظ نکلتے ہیں، ذیل کی نظم ۱۹۱۶ء میں کرسمس کے تہوار میں شاعر نے پڑھی تھی:-

"اپنی مسرتوں سے مجنون ہو کر انھوں نے تیرے پیرہن کو خاک آلود کرنے کے لئے

گرد اڑائی جس کی وجہ سے او حسن مجسم میرا دل بیمار پڑ گیا۔ میں نے تجھے پکارا

"اپنا تازیانہ اُٹھا اور ان کا فیصلہ کر"!

قوت کی یہ فرعون سامانیاں اور یہ خود غرضانہ روش جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں بے شمار بندگان خدا کی زندگیوں اور جانوں کی پامالی تھا مغربی تہذیب کو موت اور تباہی سے قریب تر لا کھڑا کیا۔ تمام قدیم سلطنتوں اور تہذیبوں کی تباہی انسان کش ذہنیت کا نتیجہ تھی۔ شاعر اس دردناک حقیقت سے ناواقف نہیں ہے۔ کہتا ہے:-

"جب کبھی قدیم تہذیبوں پر تنزل کا دور آیا اور وہ مر گئیں تو اس کا سبب سخت دلی اور انسان کی قدر کی ارزانی تھا۔ جب سلطنتوں یا کسی طاقتور انسانی گروہ نے انسان کو اپنی قوت کے بڑھانے کا آلہ سمجھا۔ جب انسان نے دوسری کمزور قوموں کو غلام بنا کر ممکنہ طور پر انھیں زیر رکھنے کی کوشش کی اور اقتدار حاصل کیا تو پھر تہذیب خود کو قائم نہ رکھ سکی۔" اسد صنادد

یورپ نے ہوا کو بویا ہے جس سے آندھیاں، بگولے اور جھکڑ پیدا ہوں گے۔ اور جدید تہذیب کو خس و خاشاک اگر وہ غبار کی طرح لے اڑیں گے۔ مادہ کی حکمرانی ہے۔ سائنس کو تباہی کا آلۂ کار بنا دیا گیا ہے جس نے آز کے

بحران میں ایک قوم دوسری قوم کو بے رحمی سے دبا رہی ہے۔ دنیا کی تمام سیاہ کاریاں مغرب کے ساحل پر اُبل پڑی ہیں۔ علامات اور آثار سے پتہ چلتا ہے کہ جنگ کے دوش پر مغربی تہذیب کا جنازہ نکلنے والا ہے، جو حالت نزع میں دم توڑ رہی ہے۔ مغربی نظام انسان کو روح نہیں بلکہ مشین سمجھتا ہے۔ وہ تباہیوں اور بربادیوں کو جلو میں لئے ہوئے زندگی اور اُس کی مسرتوں کو نظر انداز کر کے مادہ کی بارگاہ میں سربسجود ہے، روح اور وجدان کو قربان کر کے ذہن کو نواز رہا ہے۔ "اس طرح انسان کی بڑھتی ہوئی دماغی قوت اُس مبالغہ آمیز زراف کی سی ہے جس کی گردن اچانک طور پر دوسرے اعضائے جسم سے میلوں دراز ہو گئی ہے۔ اُسکا حریص منھ اور اُس کے دہشتناک جبڑے دنیا کے انتہائی بلند درختوں کے پتوں کو چبانے میں مصروف ہیں۔ مگر غذا اُس کے معدے تک پہنچنے کیلئے ایک عرصہ درکار ہے۔ اس لئے اُس کا جسم کمی خون سے بیمار ہے۔" (قومیت)۔

قومیت

قومیت بجائے خود کوئی بری چیز نہیں، مگر جب وہ خود غرضانہ اور تخریبی مفہوم اختیار کر لیتی ہے تو بری بن جاتی ہے۔ جب تک یہ انسانوں کے تحفظ کیلئے لڑے تو یہ آزادی اور حق کی حامی ہے۔ مگر جہاں اس سے کمزوروں کو غلام بنا کر ان پر حکومت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا وہ بربریت اور بہیمیت کے

مترادف ہو گا۔ جذبۂ وطن پرستی قابل احترام ہے جب تک کہ اُس کی حیثیت دفاعی ہو مقدس ہے جب تک کہ وہ آزادی اور حریت کی علمبردار ہے۔ مگر جہاں اقتدار کا جذبہ کارفرما ہو قابل ملامت ہے۔ ×

جذبۂ قومی ایک فطری جذبہ ہے۔ مذہب اور اخلاق سے بڑھ کر انسان کو اپنے مرز بوم سے محبت ہوتی ہے اگر پُر امن اور تعمیری بنیادوں پر کارفرما ہو تو بہ حیثیت مجموعی بنی نوع انسان کی فلاح کا باعث ہے۔ جب کسی قوم یا ملک کے لوگ مخلصانہ طور پر یہ محسوس کریں کہ ہمارا ملک بہتر ہے تو حقیقتاً یہ جذبہ صحیح تمدن اور تہذیب کا معمار اور ترقی و آزادی کا نگہبان ہو گا۔ اگر ہم میں حق و صداقت کی روشنی ہے اور دوسرے گھر اس نور سے محروم ہیں تو ہمارا یہ فرض ہو گا کہ اُن سیہ خانوں کو منور کریں چاہے اغیار ہمارے اس طرز عمل کو بہ طیب خاطر قبول کریں یا با لجبر۔ دنیا کے بڑے بڑے ادیان و مذاہب اولوالعزم ہادیان و علمبرداران حق و صداقت نے جیسا موقع ہوا کبھی امن و سلامتی کے وسیلہ سے اور کبھی جبر و قوت کے ذریعہ سے دنیا کو ظلمت سے نور میں تبدیل کیا اور گمراہی سے راہ راست پر لگایا۔ مگر ان مبلغین و مرسلین حق کے بعد ان کے متبعین اور عاملین میں جہاں خود غرضی۔ دنیا پرستی اور نفس پروری کا عنصر غالب ہوتا گیا تو اُسی شمع سے جس سے کہ ہدایت کا کام لیا جاتا بجائے گھروں کو منور کرنے کے گھروں کو جلانا شروع کیا تاکہ اپنا مطبخ گرم رہے۔ اسی مسخ شدہ حالت نے وطنیت اور قومیت نے شہنشاہیت کی صورت اختیار کی۔ مغربی وطن پرستی بھی دراصل اسی خود غرضی او تنگ خیالی کی تفسیر ہے۔

مغرب میں ہر قوم اپنا علیحدہ وجود بنا کر دوسروں کو زیر کر کے اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کی بے شمار ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ یورپی اقوام میں اس حسد، مسابقت۔ اور حریفی کا نتیجہ جنگ ہے۔ یورپ اب تک اپنے باطل تصورات سے چمٹا رہا اس پاداش میں اسے جنگ کی صورت میں تاوان ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ "مغرب کے ساحل پر (مسان گٹ) خود غرضی اور تنزل پذیر تہذیب کی شمع سے جلائی ہوئی نعش کے آخری شعلے بھڑک رہے ہیں۔ میدان جنگ اور کارخانوں میں توانائی کی پرستش کی جارہی ہے۔ اے تمام کائنات کے محافظ خدا وہ تجھے نہیں پوج رہے ہیں۔"

قومیت ایک عذاب بن کر رہ گئی ہے۔ یہ ایک قوم کو دوسری قوم سے علیحدہ کرتی ہے ان کے اس شگاف و خلیج کو پر کرنے والی چیز محبت نہیں بلکہ تجارتی معاہدے ہیں۔ ان کی دوستی کی بنیادیں خلوص پر نہیں بلکہ خوف و ہراس پر ہیں۔ اس خوف کا سبب اسلحہ، عسکریت، بحری بیڑے، طیارے اور کرپ کی توپوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی قوت ہے۔ وہ ممالک جہاں سیاسی تہذیب کا دور دورہ ہے وہاں ہر قوم دوسری قوم کی مادی دولت کا شکار کرنے کی وجہ سے خوف، حرص اور پریشانی کی فضا میں پل رہی ہے۔" ان کی تہذیب درندگی کی ہم معنی ہے جس کی زندگی کمزور اقوام کے خون پر منحصر ہے۔ اس کا واحد مطمح نظر یہ ہے کہ دنیا کی ساری عظمت اس کے گھر میں رہے۔ اس سے پہلے کبھی حسد کے ایسے مظاہرے دیکھے نہیں گئے۔ اور نہ دن اعتماد کی دھجیاں اڑائی گئیں۔ اور ایسے حب وطن کہا جاتا ہے جس کا مسلک سیاسی ہے۔" (قومیت)۔

اسی مغربی قومیت کا نتیجہ نفرت اور رنگ و نسل کا امتیاز اور تعصب ہے۔ دنیا اس وقت تک امن کی صورت نہیں دیکھ سکتی جب تک کہ یہ خود ساختہ امتیازات اور تعصبات نہ اٹھ جائیں۔ اگر قومیت کا خاتمہ نہ ہو سکا تو پھر قوموں کا خاتمہ ہے۔

موجودہ نظام قومیت دوسری قوموں کو ابھرنے اور اپنی خصوصیات کو نمایاں کر کے اپنی شخصیت کے اظہار کا موقع نہیں دیتا۔ رابندر ناتھ اس کے قائل ہیں کہ ہر قوم ہر فرد کی طرح مخصوص ملکات اور شخصیت کی مالک ہے۔ "ہر گروہ ایک جیتا جاگتا وجود ہے جو ایک ممتاز شخصیت رکھتا ہے اور علیحدہ روح اور ذہن کا مالک ہے۔ اسے موقع ملنا چاہیئے کہ اپنی مدفون اور خوابیدہ قوتوں کا اظہار کرے۔ ہمیں انفرادیت اور ذاتی کردار کو تسلیم کرنا چاہیئے چاہے وہ کمزور ہو یا طاقتور ہیں۔ اسی حقیقت سے انکار ہمیں جنگ کی طرف لیجائیگا۔

رابندر ناتھ اپنے خطبات "قومیت" میں "قوم" اور "عوام" میں فرق ظاہر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "قوم" سے مراد مغربی نمونہ قومیت ہے اور "عوام" سے مراد قدیم مشرقی نمونہ۔ مغربی قوم ایک ایسا گروہ ہے جس کا شیوہ قتل اور غارت گری ہے۔ وہ سروں کو مطیع کر کے حصول اقتدار اور سائنس کی مدد سے تباہی ہے۔ یہ ایک مردہ بے روح مشین ہے۔ اور وہاں کے لوگ کل پرزوں کا کام دیتے اور اپنی زندگی کو مار کر مردہ مشین کے اجزا بن جاتے ہیں۔ مگر "عوام" ایک زندہ روح ہیں۔ مشرقی خود کو قوت کے لئے نہیں بلکہ تکمیل کے لئے منظم کرتے ہیں۔ وہ نفرت قتل شبہ اور حسد نہیں کرتے۔ بلکہ زندہ رہتے اور محبت پرستش اور عبادت کرتے ہیں۔ قوم کے افراد مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔ برخلاف اس کے مشرقیوں میں زندگی

اور روح کی لچک موجود ہے۔ مگر اب مغربی اثرات کے تحت مشرق اپنی ان خصوصیات کو کھوتے جا رہے ہیں۔

"جاپان بھی ہمیں لوگوں میں سے تھا۔ مگر مغرب نے اپنی گرجدار توپوں کی آواز سے اُس سے کہا کہ تو قوم بن جا۔ اور وہ قوم بن گیا۔ اور جب تمہارے سامنے جاپانی قومیت کا کارنامہ پیش کیا جاتا ہے تو تم بھی سر ہلاتے ہو کہ یہ اچھا نہیں۔"

اس وبا نے اس قدر عالمگیر اثرات پھیلا دیے ہیں کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ قومیت بری بلا ہے ہر ملک اسی کے پھندے میں ناگزیر طریقہ پر پھنس رہا ہے۔ یورپ نے جاپان کو اس وقت تک کچھ نہ سمجھا جب تک اس نے قومیت کا جوا اپنی گردن میں ڈال نہ لیا۔ اور اب اُس کی خاطرداری اور سلوک میں احترام برتا جاتا ہے۔

"جاپان، دولت، انسانیت، حسن، اور حب وطن اور خود اظہاری کے توازن سے مالا مال تھا۔ مگر مغرب نے اُس کے احترام کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کیا جب تک جاپان نے یہ ثابت نہ کر دیا کہ ابلیس کے خونخوار کتے نہ صرف یورپ کی خندقوں میں بلکہ جاپان میں بھی پرورش پاتے ہیں جن کی غذا انسانی مصائب ہیں۔"

اگر مغرب مشرق کے تصورات اور مطمح نظر کی سطح پر پہنچ جائے تو اس کا مستقبل یقیناً اپنے ماضی سے زیادہ روشن رہیگا۔

مغرب کا مستقبل

رابندر ناتھ رجائی ہیں۔ انھیں مغرب کا مستقبل خوش آئند نظر آتا ہے۔ دنیا موجودہ تجارتی دار و گیر، حق تلفی اور غصب سے بیزار ہو چلی ہے۔ جنگ کے بعد اس احساس میں اور شدت پیدا ہو گئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جنگ باوجود اپنی تباہ کاریوں اور خون آشامیوں کے ایک نئے باب کا آغاز کرے گی اور انسان موجودہ مصائب سے رہا ہو کر امن کی طرف مائل ہو گا۔ جنگ کے جہنمی راستہ پر چلنے کی وجہ سے اسے جنت سے اور زیادہ محبت ہو گی۔ خودی کا بت ٹوٹ جائیگا۔ خود غرضی ایثار سے اور نفرت محبت سے بدل جائیگی۔ ایسی ہی فضا میں روحانی بنیادوں پر سلطنتوں کے قائم ہونے کا امکان ہے۔

"کیا انسان کی یہ قربانیاں، خون۔ ماؤں کے آنسو یوں ہی بلا معاوضہ خاک میں مل جائیں گے۔ کیا یہ اپنی قسمت سے آسمانوں کو نہیں خرید لیں گے؟"

شاعر کے عقیدے میں مضبوطی یوں بھی ہوتی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وقتاً فوقتاً یورپ ایسے اعلیٰ دماغ افراد نکلتے رہے ہیں جنھوں نے بلا امتیاز رنگ و نسل حق کی حمایت پر کمر باندھ کر انسانیت کی فلاح کی خاطر موجودہ عسکریت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور خود اپنے لوگوں سے ذلت بھی اُٹھائی۔ یہی وہ لوگ ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حیات ابدی کا جاودانی سرچشمہ ابھی خشک نہیں ہوا ہے۔ اس لئے مغرب آہستہ آہستہ دوسرا جنم اختیار کرے گا۔

یہ کہنا عین بداخلاقی ہے کہ سیاسیات میں اخلاق کی کوئی جگہ نہیں جیسے فرد کے لئے یہ ضروری ہے مملکتوں کے لئے بھی اس کی ضرورت ہے۔ جب تک بالطبع انسان صلہ رحم۔ ہمدردی بنی نوع انسان کو اپنا مذہب نہ بنائے اور جب تک دنیا جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو، کے اصول پر کاربند نہ ہوگی اور جب تک خود غرضی کو گناہ نہ سمجھا جائے گا اور ہر مملکت دوسری مملکت سے محبت، خلوص، ایثار اور قربانی سے ترقی میں ہاتھ نہ بٹائے گی، تو تمام انجمنیں اور ادارے چاہے وہ بین الاقوامی نقطۂ نگاہ ہی کیوں نہ رکھتے ہوں اور عالمگیر برادری قائم کیلئے ہی کیوں نہ قائم ہوئے ہوں بے معنی ہیں۔

رابندرا ناتھ نے جب مغربی قومیت کی مذمت کی تو اُن سے پوچھا گیا کہ وہ کس بنا پر قومیت کو بُرا کہتے ہیں جبکہ خود ہندستان محض اسی کی کمی کی وجہ سے قعر مذلت میں پڑ کر "مفتوح اور شکستہ قوم" بنا ہوا ہے۔ تو انھوں نے جواب دیا کہ "وہ خاک جس پر ہندستانی جُھکے ہوئے ہیں اُن محلوں اور ایوانوں سے زیادہ مقدس ہے جو قوت اور افتخار کے نام نہاد اینٹ گارے سے بنے ہوئے ہیں۔

کیونکہ یہ خاک زندگی، حُسن اور پرستاری سے معمور اور زرخیز ہے"۔

"وہ جو اپنے پاؤں سے زندگی کو پامال کرتے ہوئے حماقت کے راستہ پر گامزن ہیں۔ وہ جو اپنے خون آلود قدموں سے زمین کی نازک سبزی پر اپنے نقش قدم چھوڑتے جا رہے ہیں۔ انھیں خوشیاں منانے دے۔ مگر مالک میں تیرا شکر گزار ہوں کہ میری قسمت ان کے ہاتھ ہے جو حقیر ہیں۔ اور قوت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ جو تاریکی میں اپنا چہرہ چھپا کر

آہیں بھرتے کیونکہ ان کے درد کی ہر ٹیس رات کی مضمر گہرائیوں کو چھوتی ہے
اور ان کی ہر ذلت خاموشی میں جمع ہو گئی ہے۔ ... اور صبح ان کی ہے
اُو آفتاب طلوع ہو۔"

ٹیگور ہندستانیوں کو اپنی مادی پسماندہ حالت پر شرمندہ ہونے سے باز رکھتے ہیں بلکہ انہیں اس پر فخر کرنے کی تلقین کرتے ہیں :-

"میرے بھائیو۔ ان سفید سادہ لباسوں میں طاقتور اور مغرور لوگوں کے
سامنے کھڑے ہوتے ہوئے شرمندہ مت ہو۔ انکسار سے اپنا تاج بناؤ۔
اور تمہاری آزادی روح کی آزادی ہے۔ اور روزانہ خدا کے تخت کو
اپنے خشک اور افلاس زدہ چہرہ سے آراستہ کرو۔ یقین مانو ہر وہ
چیز جو جمی ہے بڑی نہیں ہے۔ غرور کبھی دیرپا نہیں۔"

ہندستان جو مشرقی ممالک کا واحد نمائندہ بن سکتا ہے تجارتی فتوحات پر کبھی اپنی قوت صرف نہیں کیا۔ اس کو اس بات پر فخر رہا ہے کہ یہ ہمیشہ اعلیٰ تصورات حسن، صداقت اور محبت کا سرچشمہ بنا رہا۔ اگر مغرب موجودہ پریشانیوں سے نجات کا طالب ہے تو سوائے مشرقی خیالات کی تتبع کے اور کوئی علاج نہیں :-

"ہاں۔ روشنی اور مسرت کی شعاعیں مشرق سے نکل رہی ہیں تاکہ دنیا کی
مقید روح کو آزاد کریں۔"

وشوابھارتی کی تبلیغ یوراپ و امریکہ کا سفر

جب جنگ عظیم کے تاریک بادل چھٹ گئے تو رابندر ناتھ نے اپنے پیام امن کی تبلیغ اور عالمگیر اخوت و برادری کی تلقین کے لئے ایک منظم نظام العمل کے ساتھ شانتی نکیتان کے استحکام اور اسکی وسعت کے لئے خود کو وقف کر دیا تاکہ یہاں مشرق و مغرب اپنی غلط فہمیوں کو دور کر کے اشتراک عمل اور دوستانہ طریقہ پر کام کرنا سیکھیں۔

اس دور میں سوائے اپنے آشرم کے کوئی اور خیال شاعر کے دماغ میں نہیں تھا۔ وہ اقصائے عالم کے تمام ممتاز مفکرین اور انسان دوست حضرات کو اپنے مشن سے واقف کرانا چاہتے تھے تاکہ جن مقاصد اور اغراض کے تحت انھوں نے آشرم کی بنا ڈالی تھی، وہ پوری ہو سکیں وہ اس امر کے متمنی تھے کہ جلد سے جلد ان کی دیرینہ تمنائیں بار آور ہو کر بنی نوع انسان کی نجات کا باعث بنیں۔

پہلے پہل تو یہ چاہتے تھے کہ ایشیا کے تمام مذاہب و ادیان کا منتشر تمدن ان کے آشرم میں ایک جگہ جمع ہو جائے۔ تاکہ وہ بقیہ دنیا کو یہ سرمایہ پیش کر سکیں چنانچہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۱۹ء میں شاعر نے ہندستان کا کونا کونا چھان مارا، اس غرض سے کہ انہیں کہیں ایسی زمین مل جائے چنانچہ یہ اپنے

خیالات کو بو سکیں اور جس سے حسب منشا پھل پھول پیدا ہوں. مگر انکی وسیع نظر نے اس تحدید کو گوارا نہ کیا اپنے آشرم میں دنیا کے مشترک تمدن کے اجتماع کا خیال پیدا ہوا آشرم کا نام وشوا بھارتی رکھا جس کے دروازے بلا امتیاز رنگ نسل خاص و عام کے لئے کھلے ہوئے ہیں.

اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے انہیں ضروری تھا کہ پھر ایک بار یورپ اور امریکہ جائیں۔ اور وہاں والوں کو اپنے آشرم کی دعوت دیں. ابھی جانے کے اہتمامات ہو ہی رہے تھے کہ ۱۹۱۹ء میں امرتسر کا وہ دردناک واقعہ پیش آیا جس کی یاد اب تک ہندستانیوں کے دل میں غیر مندمل زخم کی صورت میں موجود ہے. جب جلیان والے باغ کی ٹریجڈی کی انہیں اطلاع ملی تو یہ ایک ناقابل بیان دماغی کرب میں مبتلا ہو گئے۔ ایک زخمی شیر کی طرح اس بربریت اور استبداد کے شرمناک مظاہرہ کے خلاف اپنی جگر خراش چیخ سے ایک تہلکہ مچا دیا. کئی راتیں اس روحانی عذاب کی وجہ سے بغیر نیند کے گذر گئیں۔

انتہائی غم و غصہ کی حالت میں شاعر نے اپنے خطاب "نائٹ ہڈ" کو واپس کر دیا اور وائسرائے کو ایک قابل یادگار خط روانہ کیا جو ادبی حیثیت سے کلاسکس کا مرتبہ رکھتا ہے۔ اس خط میں اُن وجوہ کی تشریح کر دی جس کے متعلق انہیں یقین تھا کہ اُس نے ناقابل معافی مظالم روا رکھے ہیں. شاعر کے اس طرز عمل کی خبر تمام دنیا میں پھیل گئی اور اُس نے صورت حال کو ایسے طریقہ سے صاف کر دیا جو اس نازک موقع پر کسی اور طرح ممکن ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ ہندستان سے باہر بہت کم لوگوں کو علم تھا کہ مارشل لا کے پردے میں کیا کاروائیاں عمل میں آرہی ہیں.

ان واقعات نے اور زیادہ صدمہ پہنچایا جب جنرل ڈائر نے کمیشن کے روبرو گواہی دی اور امرتسر میں اپنے افعال کی یہ کہکر مدافعت کی کہ اس کا منشا پنجاب میں "اخلاقی اثر" پیدا کرنا تھا۔

یہاں ٹیگور اور گاندھی کے مطامح نظر میں کوئی فرق نہیں، ٹیگور نے گاندھی کی اس شریفانہ اپیل کا کہ حیوانی قوت کا مقابلہ روحانی قوت سے کیا جائے پورا پورا اتفاق کیا، راؤلٹ ایکٹ کے نفاذ کے بعد ۱۹۱۹ء میں تحریک ستیاگرہ جاری کرنا اور پھر تشدد کا آغاز ہو جانے پر تحریک کو بند کرا دینا ایسے افعال تھے جن پر رابندرا ناتھ ٹیگور نے شانتی نکتان سے اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا تھا۔ اسی زمانہ میں ٹیگور پروونشل کانفرنس کے صدر مقرر ہوئے اور سیاسی ماحول سے متاثر ہو کر ایک کتاب "راجا پرجا" بھی لکھی۔

وشوابھارتی کی تبلیغ کے لئے ۱۹۲۰ء کے موسم بہار میں یورپ کے عزم سے انھوں نے ساحل ہند کو خدا حافظ کہا، یہ یورپ سے امریکہ گئے اس دوران میں ان پر حزن و ملال کی کیفیت اور دماغی پستی مسلط تھی اس کا سبب یہاں امرتسر کا جلیان والا واقعہ تھا وہیں ترک موالات کی تحریک تھی جس نے عدم تشدد کے مسلک سے ہٹ کر تشدد کا رنگ اختیار کر لیا تھا جس کو رابندرا ناتھ پسند نہیں کرتے تھے۔ گاندھی جی کو بھی انھوں نے خطوط کے ذریعہ توجہ دلائی کہ وہ اپنے اُس مسلک سے ہٹ رہے ہیں جس کی بنیادیں روحانیت پر مبنی ہیں۔ اہل وطن کی ان جارحانہ کاروائیوں نے شاعر کا دماغی سکون چھین لیا چنانچہ انکے اُن خطوط کے مطالعہ سے جو انھوں نے اپنے چیلے سی، ایف آنڈریوز کو یورپ اور امریکہ کے سفر کے

دوران میں لکھے ہیں۔ اس زمانہ کے دماغی انتشار کا پتہ چلتا ہے۔ ذیل کا خط شاعر کی دماغی کیفیتوں کا اچھا مرقع ہے:۔

نیویارک۔ ۱۸ر فروری ۱۹۲۱ء

میں نے ابھی وہ خط پڑھا جو آشرم کے کسی شخص نے "پراباسی" میں شائع کیا ہے۔ اُسکے پڑھنے سے مجھے دلی صدمہ ہوا۔ یہ حب وطن کا نہایت ہی کریہ پہلو ہے۔ تنگ دماغ محبّ وطن انسانیت کے اعلیٰ تصورات کو قطع کر دیتے ہیں اور اُن کا حبُ وطن محض بیہودہ طور پر اپنی ذات، اپنی بے رحمیوں، حرص و آز، اور گندگیوں کی نمائش کرتا ہے وہ عرش پر سے خدا کو نکالکر اپنے ناپاک وجود کو بٹھا رہے ہیں۔ تمام دنیا اسی ابلیس پرستی میں مبتلا ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کس درجہ روحانی عذاب میں ہوں کہ اس ملک میں ہر طرف یہی ناپاک سلک مجھے گھیرے ہوئے ہے۔ یہاں ہر طرف ایشیا کے خلاف جذبۂ نفرت پھیلا ہوا ہے، نگروں کو زندہ جلایا جاتا ہے بعض اوقات محض اس بناء پر کہ وہ قانوناً عطا کئے ہوئے حق رائے دہی کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

میں اس ملک میں جتنا زیادہ رہتا ہوں اُتنا ہی مجھے حقیقی نجات کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔

ہندستان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے سینہ کو عقل کے امرت سے ہمیشہ معمور رکھے جس سے ایک نئے عہد اور شاندار مستقبل کی پرورش ہوگی۔

میں امن کے قلب میں رہنا چاہتا ہوں، میں نے اپنا کام ختم کر لیا ہے اور امید کرتا ہوں کہ میرا مالک مجھے اپنے بازو بیٹھنے کی اجازت دیگا باتیں کرنیکے لئے نہیں بلکہ آئی عظیم خاموشی سننے کیلئے"

گاندھی اور ٹیگور

تحریک عدم تعاون

۱۹۲۱ء کا وہ زمانہ جبکہ ترک موالات کی تحریک سارے ہندستان میں بادلوں کی طرح پھیلی ہوئی تھی، جبکہ تمام فرزندان وطن سر ہتیلیوں پہ لئے پھر رہے تھے، جبکہ ایثار و قربانی کی ہوا عام تھی۔ اسکول اور کالج مرثیہ خواں تھے کہ طالب علم نہ رہے۔ غرض سوراج کی قربان گاہ پہ ہر ہندستانی متنفس اپنی عزیز ترین دولت اور گراں مایہ سرمایۂ حیات نہایت جوش عقیدت کیساتھ پیش کرنے میں سبقت لیجانیکی کوشش کر رہا تھا۔ جذبۂ وطنیت کی گرمی اس شدت کی تھی کہ ہر غیر ہندستانی چیز کو دشمن سمجھنا قابل افتخار بات سمجھی جاتی تھی چاہے وہ اچھی کیوں نہو۔ اور ہر ہندستانی چیز کے ساتھ مجنونانہ محبت برتی جاتی چاہے وہ زبون ترین ہی کیوں نہ ہوتی۔۔۔۔۔۔ عین اسی وقت ایک ہندستانی دل ایسا بھی تھا جو ان یا جوجی کارروائیوں کو دیکھ کر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ کاش اہل ملک کو اتنی ہی سمجھ آجاتی کہ حقیقی فتح کا راستہ حقارت نہیں بلکہ محبت ہے

نفی نہیں بلکہ ایجاب ہے، دشمنی نہیں دوستی ہے، عدم تعاون نہیں بلکہ تعاون ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ ناقص اور اسفل دماغ میں جو وطنیت کے معنی کو غلط سمجھکر انسانیت کے اعلیٰ نصب العین کو قطع کرنے کے درپے ہوتے ہیں۔

اسی زمانہ میں جبکہ وطن میں ترک موالات کی آگ لگی ہوئی تھی ٹیگور مغرب میں اس کے خلاف موالات اور تعاون کا پرچار کر رہے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"میں اپنے ہم وطنوں سے محبت رکھتا ہوں۔ اور اُن کی محبت کی تعریف کرتا ہوں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے مجھے اپنی کشتی کو دھارے کے خلاف چلانے کے لئے مقرر کیا ہے۔ یہ بھی قسمت کا ایک طنز ہے کہ میں مشرق و مغرب کے تمدن کے تعاون کا خطبہ دے رہا ہوں اور عین اسی وقت سمندر کے دوسرے کنارے پر میرے ہم وطن عدم تعاون کی تبلیغ میں معروف ہیں۔"

ملک کے سیاسی بکھیڑوں سے رابندرا ناتھ ہمیشہ دور ہی رہے، کانگریس اور سیاسی کانفرنسوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ یہ ملک کی ترقی کو بالکل ہی نظر انداز کرتے ہیں۔ بلکہ عام اہل وطن سے انکا نصب العین جدا ہے۔ ان کے ہاں ترقی کا مفہوم بالکل دوسرا ہے۔ یہ کارخانوں کی بہتات کو ترقی نہیں سمجھتے، صنعت و حرفت اور زراعت کی افزونی انکے ہاں ترقی نہیں۔ اگر ملک اُن مادی شمعات سے مالامال ہو جائے جس سے آج یورپ امریکہ اور جاپان سرفراز ہیں تو بھی ان کے نزدیک یہ خوشحالی عین بے مایگی ہے۔ اصلی نصب العین، روحانی ترقی اور روحانی خوشحالی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دارۂ انسانیت

بہت وسیع ہے اور اس کے کئی پہلو ہیں۔ اس لئے ان کا دل دکھتا ہے جب وہ دیکھتے ہیں کہ تھوڑے سے مادی فائدہ کے لئے انسان اپنی شخصیت اور وجود کو مغربی دنیا میں تراش کر پھینک دیتا ہے اور انسان سے گھٹ کر صرف مشین بنجاتا ہے۔ یہاں رابندرا ناتھ بالکل ورڈسورتھ کے ہم خیال ہیں:۔

"دنیاوی کاروبار ہی ہماری کامل توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں، پیدائش اور صرف دولت میں ہماری تمام تر قوتیں ضائع ہو رہی ہیں، اور ہمیں فطرت میں کوئی ایسی چیز دکھائی نہیں دیتی جس کا تعلق ہم سے ہو۔
ہم نے اپنے دلوں کو وقف کر دیا ہے، ایک نہایت ہی ادنیٰ چیز کے حصول کے لئے۔
سمندر جو چاند کے لئے اپنی آغوش انتظار کھولے ہوئے ہے۔ ہوا جو ہر وقت ایک شور مچاتی رہتی ہے اور پھر پژمردہ پھولوں کی طرح سمٹ جاتی ہے، یہ اور اس قسم کی دیگر چیزوں سے ہم لذت گیر نہیں ہوتے۔ فطرت ہم کو متاثر نہیں کرتی۔ اے خدا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

رابندرا ناتھ قوم پرست ہیں مگر مغربی وضع کے نہیں۔ جب وہ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں تو دوسرے ملکوں سے نفرت نہیں کرتے۔ اُن کا یہ جذبۂ قومی عالمگیر محبت کا ہم معنی ہے۔ جہاں رابندرا ناتھ ہندستان کو اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے ہدایت کرتے ہیں تو وہ مغربی اصولوں پر نہیں بلکہ اس لئے کہ ہندستان اپنی پوشیدہ قوتوں کو منظر عام پر لائے اور دنیا کو روحانیت کا پیام دے:۔

"سوراج کیا ہے؟ مایا ہے۔ یہ ایک غبار ہے جو ابدی تجلیات کا کوئی نشان

چھوڑے بغیر غائب ہو جائیگا۔ ہم کتنا ہی مغرب کے سکھائے ہوئے فقرہ کو رٹا کریں
مگر ہمارا نصب العین سوراج نہیں۔ ہماری جنگ روحانی جنگ ہے۔
یہ انسان کے لئے ہے۔ ہمیں انسان کو اُن بندھنوں سے آزاد کرنا ہے
جو اُس نے اپنے اطراف بُن لئے ہیں اور یہ بندھن قومیت کے منظم
ادارے ہیں۔ نتریی کو ترغیب دلائی جائے کہ اپنے گھر کی بہ نسبت آسمان کی
بسیط فضا میں زیادہ آزادیاں ہیں۔ جب روحانیت نے طاقت،
دولت، اسلحہ کو مغلوب کر لیا تو یہی انسان کا سوراج ہے روحانی
آزادی اصلی آزادی ہے۔" (خط)۔

رابندرا ناتھ جب ہندستان سے محبت کرتے ہیں تو وہ تجارتی اور
مادی ذخیروں کی بنا پر نہیں بلکہ روحانی بنیادوں پر کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ
ہندستان ایک روح ہے۔ یہ اس کو پسند نہیں کرتے کہ ہندستان اس
قومی آزادی کی جنگ کو محض ان بنیادوں پر برقرار رکھے کہ اب اُس کے
جنگل، معدنیات، خام پیداوار اغیار کے بے جا تصرف سے غیر محفوظ ہے
خود ہندستانیوں کو ان عطیات قدرت سے فائدہ اُٹھا کر معیار زندگی کو
بڑھانے کا موقع نہیں۔ ان کے نزدیک یہ نہایت ہی پست قومی مقصد ہے۔
گو ہندستانی نقطۂ نظر سے یہ ایک بڑا نقصان ہے کہ اُس کے مادی اور
معاشی وسائل بے رحمی سے غصب کئے جا رہے ہیں، گو پیشہ ور سیاس
غیروں کے بار حکومت سے نالاں ہیں۔ مگر رابندرا ناتھ اس کی پروا
نہیں کرتے وہ روح اور تمدن کو اہمیت دیتے ہیں اور اسکی برقراری کی

تلقین کرتے رہیں۔ انکا دل اس حقیقت سے مجروح ہوتا ہے کہ ہندستان کی تمدنی، تہذیبی خصوصیات اور اُس کی روحانیت خطرہ میں ہے۔ ہندستان کا اصلی کردار اور وہ انفرادیت جو کسی قوم کی عظمت کا سبب ہے اس مادی سیلاب میں بہی جا رہی ہے۔ ہندستان کے روحانی وسائل اور قوتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ انسانی محسوسات اور تخیلات کی ربانی صلاحیتیں جو دلوں کی گہرائیوں کو پہنچتی ہیں نہ بڑھ رہی ہیں نہ گھٹ رہی ہیں ہمیں زمانہ کی اس بڑھتی ہوئی ذہنیت کا خاتمہ کر دینا چاہیئے جو روحانیت کو کھا جانا چاہتی ہے:-

"تو نے ہمیں زندہ رہنے کے لئے پیدا کیا۔
ہم اس عزت کو پوری قوت اور ارادہ سے برقرار رکھیں گے۔
کیونکہ تیری خوشنودی اور شان اسی میں ہے کہ ہم زندہ رہیں۔
اس لئے تیرے نام پر اُس قوت کا مقابلہ کریں گے جو ہماری روح پر قبضہ کرے۔" (دعائے ہند)۔

ان کے ہاں زندگی نام صرف انسان کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنیکا نہیں اور نہ مادی احتیاجات کو مار کر مرتاضیت اور رہبانیت اختیار کرنے کا۔ بلکہ دونوں کے توازن کا نام زندگی ہے:-

"تمہیں معلوم ہے کہ میں مغربی تہذیب کا قائل نہیں ہوں جیسا کہ میں اس کا قائل نہیں کہ انسان کی عظیم ترین قوت صرف جسمانی قوت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ میں اس کا بھی قائل نہیں کہ جسمانی قوت کو

ڈھایا جائے اور مادی ضرورتوں سے منھ موڑا جائے۔ حقیقت میں جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ روح اور مادہ میں توازن اور ہم آہنگی پیدا کیجائے۔ یہ توازن بالکل بنیاد اور ڈھچر کا توازن ہے۔"

ٹیگور (یونیفارمٹی) یکسانیت کے مخالف ہیں کیونکہ اس سے زندگی کا حقیقی لطف زائل ہو جاتا ہے جو تنوع میں پنہاں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر قوم اپنی مخصوص قابلیتوں اور صلاحیتوں کو دنیا کے سامنے پیش کر کے مذہب، آرٹ، ادب کے حسن سے عالمی زندگی میں موسیقیت اور رنگارنگی پیدا کرے وہ نہیں چاہتے کہ ہندستان بھی خوف وہراس کی بناء پر تنظیم، ضبط مشین اور کارکردگی کی پوجا کرے۔ بلکہ ان کا پیغام محبت ہے اور چاہتے ہیں کہ محبت ہی کے ذریعہ آزادی اور نیک نیتی کی بنیادوں پر رشتۂ قومی استوار کیا جائے تاکہ ہندستان دوبارہ زندگی کو آزاد اور تخلیقی بنا سکے۔

مہاتما گاندھی کو اس راہ کا رہبر صادق بننے دو
انھیں حقیقی خدمت کے لیے بلانے دو۔
قربانی اور ایثار کا خراج طلب کرنے دو جس کی انتہا محبت اور تخلیق ہے۔
میں نہایت خوشی سے اُن کے قدموں پر گر جاؤں گا۔ اور میں ان کا ہر حکم بجا لاؤں گا جو وہ مجھے اپنے ہم وطنوں سے تعاون خدمت اور

محبت کے لئے دیں۔
مگر میں آدمیت کے خون کو غصہ اور حقارت کی آگ روشن کرنے اور
اس آگ کو ایک گھر سے دوسرے گھر کو لگانے پہ ضائع کرنے سے انکار
کردوں گا۔
اس کے یہ معنی نہیں کہ میرے دل پہ اغیار کی ناانصافیوں اور اُن
توہینوں کا جو انھوں نے میرے ملک پہ کی ہیں کوئی صدمہ نہیں؟ بلکہ میری
آرزو یہ ہے کہ غصہ محبت کی آگ میں تبدیل ہو جائے جس سے میں پرستش کا
چراغ روشن کروں اور اپنے ملک کے ذریعہ اپنے معبود کے حضور میں
پیش کرسکوں۔" (خط)۔
گاندھی اور ٹیگور عہد حاضر کی وہ بزرگ ترین ہستیاں ہیں جن پہ تمام دنیا کی
نگاہیں اٹھی ہوئی ہیں مگر دونوں کے نقاط نگاہ اور مسلکوں میں زمین و آسمان کا
فرق ہے، گاندھی ایک خشک معلم اخلاق ہیں تو ٹیگور ایک ایسا رنگین مزاج رجائی
شاعر جو دنیا کو نعمت سمجھکر تمام تنعمات سے اپنی زندگی بھر لینا چاہتا ہے۔
گاندھی کا مسلک یہ ہے عرفان اور نجات حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ
خواہشات کو مارا جائے۔
گاندھی ازمنۂ وسطیٰ کے راہبوں کی طرح تجرد پہ نہایت گہرا اعتقاد
رکھتے ہیں، کیونکہ ان کا ایقان ہے کہ خدا دیدار حاصل کرنے کا وہی واحد
عملی طریقہ ہے۔ برخلاف اس کے ٹیگور دنیا کی مسرتوں سے دل کھول کر متمتع ہونا
چاہتے ہیں۔ وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ احساسات نفسی کا مارنا ہی اصل

راہ نجات ہے۔ اس خیال کی شدت سے مخالفت کرتے ہوئے وہ اپنی ایک نظم میں یوں کہتے ہیں:۔

''میں ترک نجات کا متمنی نہیں ہوں۔ میں مسرت کی ہزارہا بندشوں میں
آزادی کا معانقہ محسوس کرتا ہوں۔
نہیں، میں اپنے حواس کا دروازہ کبھی بند نہیں کروں گا۔ قوت باصرہ
قوت شامہ، اور قوت لامسہ کی مسرتیں تیری مسرت کو برداشت کریگی۔
ہاں، میرے تمام توہمات مسرت کی روشنی میں روشن ہو جائیں گے۔
اور میری تمام خواہشیں پختہ ہو کر محبت کا میوہ بن جائیں گی۔''

رومین رولینڈ نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے "ٹیگور ہمارے زمانہ کے افلاطون اور گاندھی سینٹ پال ہیں۔" یہ سچ کہا ہے، ٹیگور میں روحانی حسن کا وہ اعلیٰ نصب العین ہے جو افلاطون میں موجود تھا، اور اسی جامعیت اور جوش کیساتھ جو اُس یونانی شاعر فلسفی کے نام کے ساتھ ہی ہمارے ذہن میں آجاتا ہے۔ گاندھی انسانیت کے اُس اعلیٰ مقام پر نہیں پہنچے جیسا کہ ٹیگور پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ گاندھی سینٹ پال کی طرح انسانی جسم کو مع شہوانی قوتوں اور گناہوں کے ایک بدی سے تعبیر کرتے ہیں، ان کا عقیدہ ہے کہ نجات کامل صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ انسانی جسم سے مکمل آزادی حاصل ہو جائے۔

مندرجہ بالا نظم ٹیگور اور گاندھی کے فرق کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے۔ گاندھی حصول معرفت کے لئے ونمائف حواس کو مٹانا ضروری سمجھتے ہیں، مگر ٹیگور اپنے حواس کی قوتوں کو کام میں لانا مقصد زندگی سمجھتے ہیں اور ایسا نہ کرنا

خالق کی توہین ہے جس نے ہمیں یہ قوتیں عطا فرمائی ہیں۔

ٹیگور کے نزدیک دنیا "مایا" نہیں ہے، نہ تو ترک دنیا نروان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور نہ برہمچاریہ مسلک روحانیت کا مماثل، وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ خدا کی تلاش کے لئے دنیا کو ترک کرکے بارو برگ پر گذارا کرتے ہوئے خانقاہوں میں عزلت نشینی اور چلّہ کشی کیجائے کیونکہ صداقت کا وجود علائق دنیا سے خود کو علیحدہ کرنے میں نہیں بلکہ اسی میں رنگ جانے میں ہے:۔

"یہ رام نام جپنا اور تسبیح پھرانا چھوڑ! دروازہ بند کرکے خانقاہ کے سنسان اور تاریک گوشے میں تو کس کی پرستش کر رہا ہے۔

آنکھیں کھول اور دیکھ تیرا خدا تیرے روبرو ہے۔"

البتہ ذیل کی نظم میں ٹیگور، گاندھی سے کسی قدر قریب ہو گئے ہیں، خود شاعر کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ خدا کو غریب اور ادنیٰ طبقہ میں ڈھونڈا جا سکتا ہے، یہ نظم خود گاندھی کو بہت محبوب ہے، وہ عموماً اپنے بھجنوں میں اسے بھی شامل کر لیتے ہیں۔

"وہ (خدا) وہاں ہے جہاں کاشتکار سخت زمین کاشت کر رہا ہے،

اور جہاں سڑک بنانے والا پتھروں کو بیٹھا پھوڑ رہا ہے وہ دھوپ میں

اور بارش میں ان کے ساتھ ہے اور اس کے کپڑے خاک آلودہ ہیں۔

خرقہ سالوس اتار کر پھینکدے اور اسی کی طرح خاک پر اتر آ۔"

شانتی نکتان

یہ دیکھنے کے لئے کہ قدیم اور جدید اصول تعلیم کا سنگم کیسے ہو سکتا ہے۔ "شانتی نکتان" کا وجود کافی ہے، جہاں طلبا تمام جدید و قدیم علوم ہندستان قدیم کی فضا میں حاصل کرتے ہیں:۔

رابندرا ناتھ نے اپنے بچپن کی طالب علمانہ زندگی کے تلخ تجربات کی بنا پر یہ محسوس کیا کہ ہمارا موجودہ نظام تعلیم ناقص ہے، اور یہ ہماری نسلوں کو تباہی کے گڑھے کی طرف لے جا رہا ہے۔ قدیم زمانہ میں چیلا گھر بار چھوڑ کر حصول علم کے لئے شہروں کی شورشوں سے دور جنگلوں میں اپنے گرو کی خدمت میں چلا جاتا تھا، جہاں وہ مادہ اور فطرت کے قلب میں بیٹھکر گرو کی روحانی تعلیمات سے مستفید ہوتا تھا۔ یہ تعلقات شاگرد کے کردار کی تعمیر میں بڑی مدد دیتے تھے، انھیں یہ طریق تعلیم بہت پسند آیا، اور انھیں اصول پر بالپور میں آشرم کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ وہ آشرم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے اپنے ایک بنگالی مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہمیں آج کل عبادت گاہوں اور ظاہری رسومات کی ضرورت نہیں حقیقت میں ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ آشرم ہے، ہمیں ایک ایسے مقام کی ضرورت ہے جہاں فطرت کے حسن اور انسان کے اعلیٰ ارادوں میں ایک خوشگوار توازن پیدا ہو۔ ہماری عبادت کا مندر

وہ مقام ہے جہاں مظاہر قدرت اور انسان کی روح میں اتحاد ہوتا ہے۔
ہمارے مذہبی رسوم اور ارکان صرف ایثار اور عمل صالح ہی ہو سکتے ہیں۔"

ایسے تمام کام جو بعد میں بہت بار آور ثابت ہوئے ہیں ان کی ابتدا ہمیشہ حقیر ہوئی ہے۔ جس وقت رابندرا ناتھ نے اپنے آشرم کا آغاز کیا صرف دو لڑکے تھے، چار سال بعد تعداد ۶۰۱ تک پہنچی اور اب سیکڑوں کی تعداد میں طلبار اس ادارہ میں زیر تعلیم ہیں۔ یورپ، امریکہ اور روس کے سفر میں یہ ہر ملک کی تعلیمی حالت کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتے تھے اور اپنی جامعہ کو ان ملکوں کے ماہرین تعلیم سے روشناس کراتے تھے۔ اب اس جامعہ میں ہندستان کے نامور اساتذہ کے علاوہ جرمنی، روس، ایران اور یورپ و امریکہ کے دوسرے نامور علمار کا اجتماع ہے جو یہاں معروف درس و تدریس ہے۔

"شانتی نکیتان" کے روزانہ نظام العمل سے ایک حد تک اندازہ ہو گا کہ وہاں کا تعلیمی ماحول کس قسم کا ہے اور کس طریقہ پر کیا تعلیم دی جاتی ہے۔

صبح سویرے لڑکوں اور لڑکیوں کی ایک جماعت مدرسہ کے اطراف بھجن گاتے ہوئے سونے والوں کو سحر کے حسن اور سکون میں جگانے کے لئے پھرتی ہے، جوں ہی لڑکے جاگتے ہیں انھیں اپنے اپنے کمروں کی صفائی پر لگا دیا جاتا ہے، تاکہ ابتدا عمر ہی سے انھیں معلوم ہو جائے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں کسی قسم کی ذلت نہیں ہے۔ اس کے بعد کھلی ہوا میں ورزش کرائی جاتی ہے، پھر تمام لڑکے نہانے دھونے کے لئے چلے جاتے ہیں ان ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد ہر لڑکا اپنی اپنی جگہ ۱۵ منٹ کے لئے

مراقبہ میں بٹھایا جاتا ہے۔ ناشتہ کے بعد مدرسہ جانے سے پہلے ایک مختصر سی نماز ہوتی ہے جس میں اُپنشدہ کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں، صبح کا مدرسہ ۸ بجے سے ۱۱ بجے تک ہوتا ہے، اگر موسم اجازت دے تو تمام جماعتیں کھلی فضا میں مختلف درختوں کے نیچے ہوتی ہیں جہاں لڑکوں کو آزادی ہے کہ جہاں چاہیں بیٹھیں۔

۱۲ بجے دوپہر کا کھانا ہوتا ہے، گرمی کے خیال سے مدرسہ کا کام صبح ہی کو ہوتا ہے۔ دوپہر کے بعد لڑکے اپنے اسباق کی تیاری اور اُن کو یاد کرنے میں معروف ہو جاتے ہیں، مغرب سے پہلے کھیلوں اور دوسرے تفریحی مشاغل رہتے ہیں، شام ہوتے ہی کھانے کے بعد ایک گھنٹہ قصہ گوئی، اداکاری اور گانوں کا ہوتا ہے۔ میٹرک اور اُس سے اُونچی جماعتوں کے لڑکوں کے لیے شام کی پڑھائی کی ممانعت ہے، سونے سے پہلے شام کے گیت پڑھے جاتے ہیں۔ گویا ان کا دن گیتوں سے شروع ہوتا اور گیتوں ہی پر ختم ہوتا ہے، یہاں اُن گیتوں کا ترجمہ بے محل نہ ہوگا:۔

صبح کا منتریا گیت

(۱) تو ہمارا مالک ہے، ہمیں توفیق عطا کر کہ ہم تجھے اپنا ایک سمجھیں ہمیں متانت استطاعت دے کہ ہم تیرے سامنے جھکیں۔

(۲) تو مالک، وخدا ہمارے تمام گناہ معاف کر اور تمام نیکیاں بخش

ہم اُسے سجدہ کرتے ہیں جس میں مسرت ہے
" " " نیکی ہے
" " جو سرتوں کا چشمہ ہے
" " جو جسم نیکی ہے
" " جو انتہائی نیکی ہے
شانتی، شانتی، شانتی ہری اوم"

شام کا منتر یا گیت

"وہ خدا جو آگ میں ہے، جو پانی میں ہے، جو تمام دنیا پر چھایا ہوا ہے، جو پتوں میں ہے، اُس خدا کو میں پیہم سجدے کرتا ہوں"۔

جس ماحول اور اصول کے تحت اس ادارہ کی کل چل رہی ہے اُس کے متعلق رائے زنی کرنا ابھی قبل از وقت ہوگا، کیونکہ ابھی یہ تجربہ کے دور سے گذر رہا ہے، یہ شاعر کا ایک زندہ خواب ہے، ایک اعلیٰ تصور ہے، ایک ایسا مندر ہے جہاں صرف حُسن اور صداقت ہی کی پرستش کیجاتی ہے۔

"شانتی نکیتان" کو جامعہ کلکتہ نے بھی تسلیم کر لیا ہے۔ اور یہاں سے جامعہ کیلئے امیدوار تیار کئے جاتے ہیں۔ ہماری فیاض سرکار نظام نے بھی اس جامعہ کیلئے ایک لاکھ کا گراں قدر عطیہ دیا ہے جسے اسلامی تعلیمات پر صرف کیا جائے گا۔ اس سال مزید پندرہ ہزار کا عطیہ اس غرض سے منظور ہوا ہے کہ اسلامیات کے معلم کیلئے

مکان بنایا جائے۔

شانتی نکیتان کی امتیازی خصوصیت

شانتی نکیتان کے متعلق اتنا عرض کر دینے کے بعد یہ ضروری ہے کہ اُن محرکات اور اسباب کا ذکر کیا جائے جس کی وجہ سے اس کا وجود میں آنا ناگزیر ہو گیا۔

ہند جدید کی موجودہ تعلیمی مشین بالکل مادی مقاصد کے تحت کام کر رہی ہے، ٹیگور چاہتے تھے کہ اس میں تبدیلی کیجائے :۔

"موجودہ تعلیم یافتہ اپنے مغربی ہمصر کی ایک ناقص نقل ہے، اسکی آواز آواز بازگشت، اسکی زندگی دوسروں کا کہا ہوا مقولہ، اسکی روح ایک دماغ اور اسکی آزاد روح اشیاء کی غلام ہے۔" (رادھا کرشنا)

رابندرا ناتھ موجودہ تعلیم یافتہ سے اس قدر بے زار ہیں کہ چیخ اُٹھتے ہیں :۔

واقعی ہمارا ملک خدا باختہ ہے، ہمارے لئے واقعی یہ مشکل امر ہے کہ ہم زندگی برقرار رکھنے کے لیے اپنی توانائی کو محفوظ رکھیں، حقیقی معنوں میں ہمیں کوئی مدد نہیں مل رہی ہے، ہم میں کوئی ایسا نہیں جس سے گفتگو کر کے روحانی غذا حاصل کر سکیں۔ ایسا معلوم

ہوتا ہے کہ کوئی شخص نہ سوچ رہا ہے نہ محسوس کر رہا ہے، اور نہ کام کر رہا ہے۔
وہ کھاتے ہیں، پیتے ہیں دفتر کا کام کرتے ہیں، سگریٹ کے دھوئیں اڑاتے
ہیں، بیہودہ گپ شپ اڑا کر سو جاتے ہیں، جب وہ جذبات کو چھوتے
ہیں تو بہک جاتے ہیں اور جب استدلال کرتے ہیں تو اُن کے دلائل
بالکل بچوں کے سے ہوتے ہیں۔ پُر شباب، چست اور پُرسوز دل شخص
کیلئے آنکھیں ترستی ہیں، یہ تمام سائے ہیں جو دنیا کی دست بُرد سے
باہر ہیں۔" (خطوط۔ ماڈرن ریویو ۱۹۱۷ء)

یہ مغربی تعلیم کی ہندستانی پیداوار اپنا اصلی وجود نہیں رکھتی بلکہ
سایہ ہے، نہ اُن کی زندگی میں آرٹ ہے اور نہ اُن کی روح میں موسیقی
"موجودہ تعلیم نے ایک غلامانہ دماغ کی پرورش کی ہے" (رادھا کرشنا)

بقول کمار سوامی:۔

"موجودہ نسل نے آرٹ کو نمائشوں اور تصویر خانوں میں اور علم کو
کتب خانوں اور کتابوں کی دکانوں میں مذہب کو الہامی کتابوں
اور اقراروں میں اور موسیقی کو گراموفونوں میں بند کر دیا ہے۔"

آج کل کے مدرسے ایک کارخانہ ہیں جو خصوصیت کے ساتھ ایک ہی قسم کی
اشیاء پیدا کرنے کے لئے چل رہے ہیں۔

تعلیم کا حقیقی مقصد صداقت سے اتحاد پیدا کرانا ہے، عہد گزشتہ میں
جبکہ زندگی بہت سادہ تھی۔ انسان کے مختلف اجزا مکمل اور موزوں
حالت میں تھے، جب وہ وقت آیا کہ ذہن کو روح اور جسم سے علیحدہ کر دیا گیا تو

تعلیم نے پورا زور ذہن اور جسم کی ترقی پر صرف کیا، ہم اپنی پوری توجہ اس پر صرف کرتے ہیں کہ بچہ کو معلومات بہم پہنچائی جائیں اور نہیں جانتے کہ ایسا ہونے سے ایک زبردست دراڑ ذہن، جسمانی اور روحانی زندگی میں پیدا کر رہے ہیں مگر اب اس روحانی زندگی کی ترقی اور نشو ونمو ہو تو کیسے ہو جبکہ موجودہ طرز تعلیم کے مطابق انسان کو خودی کے اظہار کی آزادی ہی نہیں، یہاں تو اس کو خواستہ یا نخواستہ ہر وہ چیز گھول کر پینا پڑتی ہے جو شریک نصاب ہے، چاہے معدہ ہضم کرے یا نہ کرے اس سے مطلب نہیں، تعلیم کے حاصل کرنیکا مقصد حصول علم سے زیادہ کامیابی امتحان رہ گیا ہے، مذہبی، حسن کارانہ، اخلاقی اور روحانی پہلو الجبرا، سائنس اور معاشرتی قوانین کے رٹنے میں ڈوب جاتے ہیں، موجودہ تعلیم یافتہ کا واحد امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے شاندار ماضی کو بھولتا جا رہا ہے، وہ باطنی روحانیت جو ہندستانی نسل کا طرۂ امتیاز ہے اس سے کوسوں دور ہے، وہ روح شکن اور شکم پرور ہے، اس کے پیش نظر اپنی زندگی کا مستقبل ہوتا ہے، زندگی میں بھی اُسے صرف وہی پیشے نظر آتے ہیں جو یا تو میکانکی ہیں یا دفتری اُس کی آنکھیں انسانی روح کی اُس اعلیٰ تعمیر کے دیکھنے کے لئے بند ہیں جو اُس کے قومی ادب میں پوشیدہ ہے۔

"وہ اپنی تاریخ ماضی کی انتہائی بلندی سے نکلی ہوئی ندی کے راستہ میں زبردست رکاوٹ ہے، اس طرز عمل سے آئندہ نسلیں اُس آبحیات سے محروم رہ جائینگی جس کی وجہ سے اس کا مسلک حسن اور طاقت کی فراوانی سے زرخیز رہا ہے۔"

اعلیٰ تعلیم وہ ہے جو نہ صرف معلومات بہم پہنچائے بلکہ ہر وجود کے ساتھ توازن پیدا کرنے کی اہل بنائے۔ اور یہ مقاصد موجودہ مدرسوں یا کالجوں سے حاصل نہیں ہو سکتے، اس لئے رابندرا ناتھ آشرم پر زور دیتے ہیں اور ان کا ایمان ہے کہ آشرم ہی میں روحانی اور تمدنی تعلیم کی پرورش ہو سکتی ہے :-

"ہر اُس سانس میں جو ہم کھینچتے ہیں ہمیں یہ احساس ہونا چاہیئے کہ ہم اُس ذات اعظم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

عہد قدیم میں اس کا امکان تھا کیونکہ آشرم میں گھر، مدرسہ، مندر سب جمع تھے اور اُستاد ہمیشہ خدا کے وجود کو حاضر سمجھتا تھا اور اسی کی حضور میں زندگی بسر ہوا کرتی تھی، اپنے اس عقیدہ کو تقویت پہنچانے کے لئے انھوں نے بالپور میں "شانتی نکتان" کی بنیاد ڈالی

شانتی نکتان اور مذہب

دنیا کی ہر عظیم شخصیت جس نے انسانی تصورات کے سانچے بدل دئے ضرور ایک پیام اپنے ساتھ رکھتی تھی، رابندرا ناتھ ٹیگور بھی اپنے ساتھ ایک پیام رکھتے ہیں ان کی تحریرات قومیت کے تنگ اور محدود حلقہ ہی میں جکڑ نہیں لگائیں بلکہ ان کا مقصد وسیع اور عالمی ہے، دنیا کی موجودہ پستی سے وہ متاثر ہیں ایک نسخہ اپنے پاس رکھتے ہیں جس سے موجودہ بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے،

ڈاکٹر سندرلین کرسچین رجسٹر میں لکھتے ہیں :-

"دُنیا کے کسی اور ملک نے زندگی اور مذہب کے متعلق ایسے اعلیٰ مفکرین نہیں پیدا کیے جتنے کہ ہندستان ماضی نے کیے، ہند جدید سوائے ڈاکٹر ٹیگور کے کوئی اور وسیع الخیال ہمدرد، اور عامل معلم اخلاق نہیں رکھتا، اور نہ ان کے سوا کوئی ایسا ہے جو ہماری بساط کے موافق دی ہوئی چیزوں کو قبول کر کے اپنے تاریخی ملک کی بہترین دانشمندیوں کو ہمیں دے۔"

سب سے زیادہ اہم مسئلہ جو اس وقت شاعر کے پیش نظر ہے وہ ہندستا کا مذہبی مستقبل ہے، وہ ایک ایسا لائحہ عمل پیش کرتے ہیں جس سے ہندستان کی تمام فرقہ بندیوں کا خاتمہ ہو جائے اور ملک بہ حیثیت مجموعی محبت کے رشتہ میں منسلک ہو کر ترقی کرے، وہ ایک ایسے ہندستان کا تصور ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جہاں ہر شخص بغیر کسی جھگڑے اور غلط فہمی کے خدائے واحد کی والہانہ انہماک کیساتھ پرستش کرتا ہو، چاہے جس طریقہ سے بھی ہو، ٹیگور جس وحدت کے راگ کو الاپ رہے ہیں اس کی رو سے وہ کبھی اس کے روادار نہیں کہ جسم اور روح مادہ اور زندگی فرد اور جماعت، ملت و قوم، سلطنت اور دنیا کی تفریقیں پیدا کیجائیں ان کا مذہبی پیام بہت سادہ ہے "مذہب سے جیتے رہو" مسرت صرف اُن لوگوں کے لئے ہے جو اس وحدت کو پہچانتے اور اُس "کل محض" کی ذات کو مانتے ہیں۔ انبساط صرف انھیں کے لئے ہے جو ضمیر کی باطنی آواز پر لبیک کہتے ہیں، ان کا مذہب بے جا قیود اور پابندیوں کا خشک مجموعہ نہیں ہے، جہاں خلوص اور

محبت کی بجائے سزا اور خوف کا جذبہ کار فرما ہو، بلکہ وہ ایک ایسا مسلک ہے جہاں ہر فرقہ اور عقیدے کا شخص بلا کسی جبر و اکراہ کے طمانیت قلب حاصل کر سکتا ہے، وہ صرف ایک خدا کی عبادت پر زور دیتے ہیں جو تمام کائنات کا مالک ہے، جس کا ظہور ہر ذرہ میں موجود ہے۔

+ ٹیگور اس امید کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہیں کہ ہندستان جہاں دنیا کے تمام مذاہب کا اجتماع ہے اس کے باشندے اپنی باہمی مخالفتوں پر فتح پا کر ایک سمجھوتے پر پہنچ جائیں گے:۔

"ہندو، بدھ، مسلمان، عیسائی، ہندستان کی سرزمین پر آئندہ لڑینگے نہیں وہ یہاں ایک یگانگت اور ہم آہنگی حاصل کریں گے، اور یہ ہم آہنگی غیر ہندو نہیں ہوگی، ظاہری شکل چاہے کچھ ہی ہو مگر توازن بالکل ہندی اسپرٹ کا ہوگا"

ہندستانی چاہے وہ ہندو ہو کہ مسلمان ہندستان ہی کو اپنا اور اپنے اسلاف کا وطن سمجھتا ہے جہاں اس کے اوتار اور اولیاء نے جنم لیا ہے، یہی انکی نیکیوں اور مذہب کی جگہ ہے۔ اسی ملک کی ترقی سے شاعر کی امیدیں وابستہ ہیں۔

ٹیگور صوفی ہیں، پنڈت یا مولوی نہیں ہیں، وہ خدا کی پر خلوص محبت اور خدمت خلق کو اپنا مذہب سمجھتے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، عبادت سے مراد صرف تزکیہ نفس اور صفائی قلب ہے، ظاہری مراسم اکورانہ معتقدات تو ہمات مذہبی اقتدار خود غرضی اور فرقہ سازی ان کے ہاں کفر ہے ہندستان کو جو اور

ممالک سے زیادہ ان برائیوں کا شکار بنا ہوا ہے۔ رابندرا ناتھ ان تمام آلائشوں سے پاک کرکے حق سے ملا دینے کے متمنی ہیں۔

شانتی نکتان کے دوسرے پہلو

ٹیگور "شانتی نکتان" میں ایسی فضا کی تخلیق چاہتے ہیں جس میں طلبا رکے جمالیاتی اور وجدانی احساسات کی تربیت ہو، وہ نہیں چاہتے کہ یہ ادارہ جو امن وسلامتی کا علم بردار ہے سیاسیات کے بھنور میں پھنسکر اپنی تصوری اور بنیادی وجہ امتیاز کھو بیٹھے، تحریک عدم تعاون کے زمانہ میں جبکہ یہ اپنے وطن سے دور تھے بار بار خطوط کے ذریعہ اس امر کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ کہیں "شانتی نکتان" سیاسیات کی آلودگیوں سے اپنا دامن ناپاک نہ کرلے، چنانچہ اپنے چیلے آنڈریوز کو متعدد خطوط میں یوں لکھتے ہیں:۔

"ایک بات میں تم سے کہنا چاہتا ہوں، "شانتی نکتان" کو سیاسیات کی آگ سے محفوظ رکھو، میں جانتا ہوں کہ ہندستان میں سیاسی مسائل میں حد درجہ شدت پیدا ہوگئی ہے، مگر ساتھ ہی ساتھ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارا مسلک سیاسیات نہیں ہے، جہاں میں سیاسیات میں آگیا تو سمجھ لو کہ میں "شانتی نکتان" کا نہیں ہوں۔

ہمارا مطمح نظر سیاسیات سے بہت ارفع واعلیٰ ہونا چاہیئے "شانتی نکتان"

اس وجہ سے ہے کہ وہ دنیا کے مزدوروں کے لئے جگہ فراہم کرے۔ ہمیں
چاہیئے کہ اس عصر کے مہمان (انسان) کی رہائش کے لیے اہتمام کریں، اور
سیاسی اُلجھنوں سے اپنے راستہ کو صاف کریں۔
"شانتی نکتان" کو سیاسیات کے گرد آلود بگولے سے محفوظ رکھو۔"

غرض ایک جگہ نہیں کئی جگہ اس امر پر زور دیا ہے کہ "شانتی نکتان" سیاسیات کا
اکھاڑہ نہیں بلکہ حسن و صداقت کا گہوارہ ہے، یہ ادارہ متعصب قوم پرست
ہندی نہیں پیدا کرتا ہے بلکہ روادار انسان۔

اب شاعر کی تمام تر توجہ "شانتی نکتان" پر ہی ہے، کیونکہ یہی ان کی
زندگی کا تعمیری کارنامہ ہے، وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کی تمام قوموں کا تمدن اور ان کی
تہذیب یہاں اس رنگ میں سموئی جائے کہ بہ حیثیت مجموعی وہ کل دنیا کے لئے
قابل قبول ہو سکے۔ خصوصیت کے ساتھ آج کل وہ اس امر کے لئے کوشاں
ہیں کہ ہندستان کی تہذیب قدیم کا پھر احیا ہو، پرانی تعلیمات اور فنون لطیفہ کو
پھر زندہ دیکھنے کے متمنی ہیں، اس ضمن میں "شانتی نکتان" میں کامیاب اور پُرخلوص
کوششیں جاری ہیں۔ طلبا کی تربیت کے لئے بنگال اور دوسرے ممالک کے
مشہور اور ماہر آرٹسٹ یہاں جمع کئے گئے ہیں۔ مصوری، شعر، موسیقی، ڈرامہ
اور اداکاری پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ تمام فنون لطیفہ مذہبی تقدس کی
حیثیت رکھتے ہیں۔

ٹیگور خود اچھے ماہر موسیقی ہیں، جس کا ذکر اس سے پہلے متعدد مقامات پر
آچکا ہے۔ یہ مصور بھی ہیں، مگر ان کی تصویریں عجیب و غریب ہوتی ہیں اور

عموماً ناقابل فہم، جب شاعر نے امریکہ میں اپنی تصویروں کی نمائش کی تھی تو لوگوں نے دریافت کیا کہ آخر ان کا مطلب کیا ہے، تو شاعر نے یوں جواب دیا۔

"اگر میں مطلب الفاظ کے ذریعہ سمجھا سکتا تو تصویر کیوں کھینچتا؟"

غرض ان کی تصویروں میں ایسی موہومیت ہے کہ وہی سمجھیں یا خدا۔

"شانتی نکیتن" کی ایک شاخ "سری نکیتن" ہے جو معاشرتی خدمات کا کام انجام دیتی ہے۔ دیہی تنظیم کے لئے ہندوستان بھر میں یہی ایک وہ مقام ہے جہاں اصولی اور پُر خلوص طور پر کام انجام پا رہا ہے، دوسرے صوبوں سے امداد باہمی کی انجمنیں یہاں امیدواروں کو کام سیکھنے کے لئے بھیجتی ہیں۔

ہندوستان کے دیگر مقامات کے مقابلہ میں ٹیگور کے وہ رمزی ڈرامے قابل توجہ ہیں جو آئے دن "شانتی نکیتن" میں کھیلے جاتے ہیں، ٹیگور کا خاندان ہمیشہ تھیٹر سے دلچسپی لیتا رہا ہے، گھر کے افراد کی تنوع کا یہ عالم تھا کہ شاعر ٹیگور نے اگر کوئی ڈرامہ لکھا تو کسی بھائی نے ان کی غزلوں کو راگ میں منتقل کر دیا، دوسرے بھائی نے مناظر کو رمزی انداز میں نقش کی صورت میں پردہ پر منتقل کر دیا۔ گھر کے جوان، بچے، بچیاں اداکاروں کی حیثیت سے کام کرتے، گھر کا صحن تھیٹر کے ہال کا اور برآمدے، صحن اسٹیج کا کام دیتے۔ خاندان کے دوسرے افراد جن کی تعداد بہت بڑی ہوتی اور دوسرے احباب تماشہ بین بنتے۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں ڈاکٹر ٹیگور کا جمالیاتی اور ڈرامائی حس تربیت پاتا رہا۔

اب "شانتی نکیتن" میں بسنت اور ماگھ کے موقع پر ٹیگور کے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں، جن کے اداکار "شانتی نکیتن" ہی کے لڑکے لڑکیاں ہوتے ہیں، اکثر

ڈراموں میں خود شاعر حصہ لیتے رہیں۔ ڈرامے کھلی ہوا میں پیش کئے جاتے رہیں جو پردہ وو کی مصنوعی منظر آرائی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ فطرت کے اصلی اور زندہ مناظر "پس منظر" کا کام دیتے ہیں جو ڈرامہ کے گانوں، واقعہ کی تشکیل اور اُس کے ارتقاء میں مدد دیتے ہیں۔ اس قبیل کے ڈراموں کے لئے "اندھیرے کمرہ کا بادشاہ" مثالاً پیش کیا جا سکتا ہے، جس میں متعدد گانے ہیں، گو کھیل میں منظریت کم ہوتی ہے مگر شاعر اس کمی کو رنگ برنگ کے ملبوس سے پورا کرتا ہے۔ موسیقیانہ مقاصد کے لئے صرف دلربا سے کام لیا جاتا ہے، اداکاری میں آواز اور چہرے کے اتار چڑھاؤ میں تصنع یک لخت حرام ہے۔

ٹیگور نے بعض ڈرامے محض بچوں کے لئے لکھے ہیں "حلقہ بہار" کا اس ضمن میں نام لیا جا سکتا ہے مگر زیادہ قابل ذکر "رقصاں لڑکیوں کی عبادت" ہے جس میں تمام کردار زنانہ ہیں جس کو "شانتی نکیتان" کی لڑکیوں نے ۱۹۳۲ء میں ٹیگور کی سالگرہ کے موقع پر کھیلا تھا۔ ٹیگور نے جدید طرز کے "واقعہ آمیز" ڈرامے بھی لکھے ہیں مثلاً "راجہ رانی" مگر یہ اس قسم کے ڈراموں میں زیادہ کامیاب نہیں ہیں جیسا کہ رمزی ڈراموں میں ہیں۔

۱۹۳۳ء میں ٹیگور نے "شانتی نکیتان" کی لڑکیوں اور لڑکوں کو لیکر ہندستان کے مختلف مقامات کا سفر کیا اور وہاں اپنے ڈرامے پیش کئے، ان کی آمدنی اور عطیات سے "وشوا بھارتی" کو استحکام بخشا۔ اس سلسلہ میں یہ پہلی مرتبہ جزیرہ سیلون بھی گئے جہاں ان کی بڑی قدر و منزلت کی گئی، خود شاعر نے اس مقام کو بیحد پسند کیا۔ ان کے اس ڈرامائی سفر میں اُن کا تازہ ترین ڈرامہ "رڈ آولینڈر" بھی پیش

کیا گیا جس میں دورِ جدید کی میکانکی تہذیب کی مذمت کیگئی ہے کہ اس نے فطرت کی سادگی اور اُس کے حُسن کو مجروح کیا ہے۔

رابندرا ناتھ ٹیگور نے اپنے مشن کی تبلیغ اور وشوا بھارتی کو دنیا کے تمام تمدنوں کا مرکز بنانے کے لئے دنیا کا مختلف زمانوں میں سفر کیا جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے، اسی ضمن میں ۱۹۳۰ء میں روس سے بھی دعوت نامہ آیا تھا یہ وہاں گئے اور نوجوان روس کی تعلیمی حالت کا مطالعہ کیا، اس ملاقات کیوجہ سے اُن غلط فہمیوں کا ایک حد تک ازالہ ہوا جو روس کے متعلق عام طور پر پھیلی ہوئی ہیں، ٹیگور روس کی تنظیم اور مزدوروں کی حکومت سے بیحد متاثر ہوئے۔ تمدنی اتحاد کے سلسلہ میں شاہ ایران نے بھی انھیں بلایا تھا، واپسی پر یہ اپنے ساتھ وہاں کے مشہور ادیب اور شاعر پور داؤد کو بھی ساتھ لائے۔

"شانتی نکتان" کے مختلف پہلوؤں کا یہ خاکہ اس ادارہ کی حقیقی اسپرٹ کے سمجھنے کے لئے کافی ہے، نہ صرف اس ادارہ کے سمجھنے میں یہ ممد ہوگا بلکہ خود شاعر کی شخصیت کے سمجھنے میں بھی، کیونکہ "شانتی نکتان" شاعر کے باطن اور اس کے شاعرانہ تخیلات کا جیتا جاگتا مرقع ہے۔